مجھے ہے حکمِ اذاں لاالٰہ الا اللہ

مؤذن بارگاہِ رسالت مآب سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت سیّدنا

بلال ابن رباح رضی اللہ عنہ

عبّاس محمود العقاد



حضرت سیّدنا

بلال ابن رباح رضی اللہ عنہ

شخصیّت اور کردار

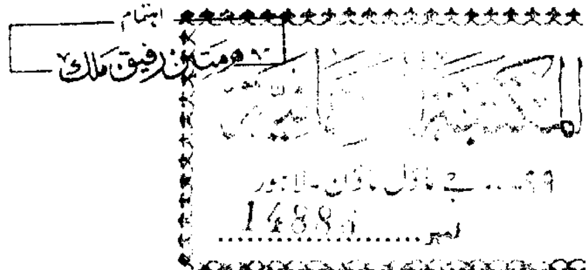
تصنیف ــــــ عبّاس محمود العقاد



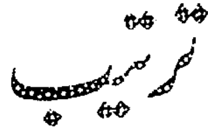
ناشر: ادبستان لاہور

بیادِ بانی اِدارہ محمد رفیق ملک

اشاعت ——— اپریل ۱۹۹۸ء
طباعت ——— آفسٹ سفید کاغذ
ضخامت ——— ۱۳۶ صفحات
طابع ——— شریف پرنٹرز، لاہور
ناشر ——— ادبستان، لاہور
قیمت ——— ۸۰ روپے



ادبستان - ۸ - بینک اسکوئر - دی مال - لاہور
فون: ۷۳۵۳۰۶۶ - ۷۳۲۱۶۶۶


ترتیب

تبصرہ

مشہور انگریزی ادیب وانشاء پرداز لافکاڈیو ہیرن نے جو مقالہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر امور سے متعلق انگریزی میں تحریر کیا ہے اس کا ہم نے عربی میں ترجمہ کیا ہے، موصوف نے اپنی تحریر کے دوران مشرقی زندگی، اس کے آداب اور طور طریقوں کو جن میں روحانیت اور دینی اقدار کا امتزاج ہوتا ہے مغربی افکار کی روشنی میں پرکھا اور دیکھا ہے اور باوجودیکہ انہوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد تاریخی مصادر و مآخذ پر رکھی ہے پھر بھی ان کی تحریر ایسی لغزشوں اور غلطیوں سے پاک نہیں ہے جو بالعموم مستشرقین سے سرزد ہوتی ہیں۔ اور یہ غلطیاں بالعموم ان کو اپنے موضوع کو دلچسپ وخوبصورت بنانے اور ان کی صیقل گری کرنے کی کوشش میں پیش آتی ہیں۔ چنانچہ اس مقالہ میں بھی ایسی کئی فروگزاشتیں مسٹر لافکاڈیو ہیرن سے بھی سرزد ہوئی ہیں جن کی ہم یہاں سرسری طور پر نشاندہی کر کے تصحیح و اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ منجملہ دیگر غلطیوں اور فروگزاشتوں کے ایک غلط اور بے بنیاد بات ابورویحہ کے متعلق بھی ہے جن کو موصوف نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حقیقی یا سوتیلا بھائی سمجھ لیا ہے حالانکہ تحقیقی طور پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے حقیقی یا سوتیلے بھائی نہ تھے بلکہ ان دونوں میں اسی طرح کی مواخاۃ اور دینی بھائی چارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مسلمانوں یعنی انصار اور مہاجرین کے درمیان مدینہ آکر قائم کیا تھا۔

موصوف کی دوسری غلطی وہ ہے جو ان کو بلاد عرب میں حبشی غلاموں اور باندیوں کے بکثرت مغنی اور مغنیہ ہونے اور اصل عرب باشندوں میں ان کی کمی اور قلت کے سبب محسوس ہوئی ہے۔ ان کے خیال میں اصل عربوں میں صوتی آلات کی کمی، فنی مہارت کا

فقدان اور عدم قدرت تھی جب کہ حبشی غلام اور باندیاں اس نقص سے پاک اور بری تھیں اس لئے انہوں نے نہ صرف حجاز میں فن موسیقی اور غنا کو اپنایا اور اس کو ترقی دی بلکہ عالم اسلام کے دیگر حصوں میں بھی انہوں نے اس فن میں بھرپور حصہ لیا، ادیب موصوف کی مذکورہ بالا توجیہہ و تعلیل صداقت وصواب سے قطعاً خالی اور بعید ہے۔

اس لئے کہ ہم آج بھی عربوں کی آواز اور نغموں کو اس طرح توجہ اور شوق سے سنتے ہیں جس طرح ان کے صوتی اتار چڑھاؤ اور لب ولہجہ کو قبل از اسلام پورے انہماک اور توجہ سے سنا کرتے تھے لہٰذا ہم ان کے کسی طبقہ میں بھی آواز کے زیر و بم، اس کی ادائیگی، اس کے اتار چڑھاؤ اور آہستگی و بلندی میں کسی طرح کی بھی کمی نہیں پاتے ہیں البتہ وہ غنایت اور موسیقی سے اس دور میں اس خیال سے احتراز و اجتناب کرتے تھے کہ اس نوع کی نغمگی اور غنائیت و موسیقیت ان کی بدویانہ و مردانہ زندگی کے برخلاف نسائیت یا بالفاظ دیگر مخنث ہونے کے مترادف سمجھی جاتی تھی اور ان کی بہادرانہ، جنگی زندگی اور شریفانہ طرز حیات کے قطعاً منافی تھی۔ وہ نہ صرف مشہور اہل حرب اور میدان جنگ کے شہسوار تھے بلکہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہنے کی وجہ سے قافلوں کے ساتھ سردیوں اور گرمیوں میں طول طویل اور صبر آزما سفر کیا کرتے تھے اور کش مکش حیات سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ عربوں کو یہ تمام مردانہ اوصاف وراثت میں ملے تھے جو عہد اسلامی کے زریں دور تک قائم رہے اس لئے غنا اور راگ رنگ کی باتیں حبشی موالیوں اور زنجی کنیزوں یا مخنثوں اور ہیجڑوں تک محدود رہیں جو اسی مقصد سے زنانہ لباس بھی پہنتے تھے اور انہی کی طرح میک اپ اور بناؤ سنگھار کیا کرتے تھے اور لمبے لمبے بال بھی رکھتے تھے انہی سے یورپ کے لوگوں نے بھی یہ عادات و اطوار اور خصلتیں سیکھی تھیں جس کو انہوں نے دیگر اصحاب فنون مثلاً موسیقاروں، مصوروں اور ڈرامہ آرٹسٹوں وغیرہ میں عام کر دیا تھا۔ یہ وضع قطع، تراش خراش اور بناؤ سنگھار کا انداز ان میں زمانہ حال تک باقی تھا جس کو انہوں نے اندلس سے سیکھا تھا اور اندلس والوں نے حجاز کے شہروں میں اہل صنعت کے ذریعہ منتقل کیا تھا۔ غرضیکہ گانے والے موالیوں اور گانے والی باندیوں کی کثرت کی وجہ وہ تھی جو بیان کی گئی ہے نہ کہ اصل عربوں کی ادائیگی آواز میں عاجزی اور کم مائیگی۔

غرضیکہ عربوں میں نغمہ وغنا کی صنعت اور موسیقی کا فن فی الجملہ موجود تھا مگر یہ حدی

خوانی اور رجز خوانی کی شکل تک محدود تھا۔ جس میں عربوں نے انتہائی کمال اور درک حاصل کیا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کی آواز اذان کے لئے اس لئے استعمال میں نہیں لائی گئی کہ وہ نغمگی اور غنا کے فن سے واقف تھے اس کے برخلاف وہ تو حجاز کی وادی میں اونٹوں کو چراتے تھے اور حدی خوانی کرتے ہوئے حجاز اور یمن یا حجاز اور شام کے درمیانی راہوں اور علاقوں میں اونٹ چراتے تھے۔ بہرحال ان کے متعلق یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ اس نوع کی حدی خوانی کے علاوہ وہ قبل از اسلام کسی اور قسم کی غنائیت میں کبھی بھی مشغول رہے ہوں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی بلند و بالا اور خوبصورت آواز صرف جنگ کے میدان اور حدی خوانی کے لئے ہمیشہ مشہور رہی ہے، ان کا تقویٰ، غیرت و حمیت، نماز کی پابندی عبادت کا شغف اور مسجد کے بام و در سے دائمی وابستگی ایسی خصوصیات تھیں جنہوں نے ان کو موذن اول کی حیثیت سے ہمیشہ معروف و ممتاز بنائے رکھا۔

"عباس محمود العقاد"

ابتدائی کلمات

حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اور آپؓ کا حسن امتیاز

حضرت سیدنا بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کے اسم گرامی سے مسلم دنیا ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی آشنا ہیں۔ مغربی مفکروں' ادیبوں اور دانشوروں نے حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی شخصیت و کردار پر اور بحیثیت مؤذن الرسل ﷺ اور خادم الرسل ﷺ کے عنوانات سے مقالے لکھے ہیں۔

زیر نظر کتاب بھی ایک انگریز ادیب کے مقالہ کی روشنی میں مصر کے نامور سیرت نگار' مورخ اور محقق جناب عباس محمود العقاد نے اسے اپنے اسلوب سے تحریر کی ہے اور اس انگریز مصنف کی فرو گزاشتوں اور منجملہ غلطیوں کی تصحیح و اصلاح بھی کی ہے۔

قارئین کرام! بوستان رسالتؐ کے محافظ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے مجاہد کی حیثیت سے اسلام کا دفاع کیا اور تمام غزوات میں حصہ لیا۔ صحیح بخاری میں بدریوں کی جو فہرست ہے اس میں حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کا نام درج ہے اور اہل بدر کی فضیلت سے ایک زمانہ آشنا ہے حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی زندگی کا مقصد ہی حضوری میں رہنا اور اور ضروری خدمت بجالانا تھا آپ (رضی اللہ عنہ) آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں رہے' اسلام نے انسانی مساوات کا جو تصور دیا ہے اسی کا ایک مظہر حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی ذات بھی ہے

حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو اسلامی برادری میں وہ بلند مقام ملا جس پر

اونچے خاندانوں کے بڑے بڑے سرداروں کو بھی رشک آتا تھا۔ کسی ایک کتاب میں ایک واقعہ پڑھا تھا کہ ایک دن اہل مدینہ نے یہ منظر دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں بازار سے گزر رہے ہیں۔ آگے آگے حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ ہیں' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں یا سیدی بلال (رضی اللہ عنہ) کہہ کر خطاب کیا تنہا یہ مقام حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا کہ خلیفہ وقت انہیں اپنا آقا کہہ کر پکارتے ہیں اور جب حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو کہا کہ "مات الیوم سیدنا" آج ہمارا سردار فوت ہو گیا۔ شبلی نعمانی نے اسی واقعہ کو نظم کیا ہے۔

عہد فاروقؓ میں جس دن کہ ہوئی ان کی وفات
یہ کہا حضرت فاروقؓ نے بادیدہ تر
اٹھ گیا آج زمانے سے "ہمارا آقا"
اٹھ گیا آج نقیب چشم پیغمبر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک روز حضرت بلالؓ سے کہا میں آپ کو کوئی منصب دینا چاہتا ہوں' حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنی سیر چشمی اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مئے شبانہ کے کیف میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں ریاست کے کسی عہدہ یا اعزاز کی خواہش ہی کیوں ہونے لگی معاً" اپنی قمیض الٹ کر سینے کے وہ پھول دکھائے جو امیہ بن خلف کی ستم رانیوں اور ظلم کی آگ میں کھل کر اپنے دوامی نقوش چھوڑ گئے تھے' ان زخموں کی زبان پکارے دیتی تھی کہ یہ طغرے کیا کم ہیں کہ کسی منصب کی آرزو دل میں پیدا ہو۔

قارئین کرام! اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ڈھب سے حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی تربیت فرمائی اس کا تقاضا تھا کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ ہر حال میں قانع رہتے اور انہوں نے مدت العمر اپنی خواہشات کے دامن کو سمیٹے رکھا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کا افضل ترین جہاد بھی تھا۔

حضرت سیدنا بلال رضی اللہ مؤذن الرسلؐ کے مقام پر زیادہ جاننے اور پہچانے

جاتے ہیں۔ آپؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ تک اذان دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صرف دو مرتبہ اذان دی' ایک موقع پر جب آپ (رضی اللہ عنہ) مدینہ گئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں نے فرمائش کی اور دوسری مرتبہ یروشلم میں اذان دی' یاد رہے یروشلم بیت المقدس کا نام ہے' ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کا قبلہ تھا اور اب عیسائیوں اور یہودیوں کا قبلہ ہے۔

حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو مؤذن کی حیثیت سے اس وقت عروج حاصل ہوا جب مکہ مکرمہ فتح کر لیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا اور اذان دینے کا حکم فرمایا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اذان کے الفاظ جفت اور اقامت کے الفاظ طاق ادا کریں۔ لہٰذا حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے پہلی مرتبہ کعبے کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دی اور یہ ظہر کی اذان تھی اور یہ وہی کعبہ تھا جہاں اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کا نام پکارنا جرم بن گیا تھا یہ حریم قدس تھا جس کو ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائے واحد کی پرستش کے لیے تعمیر کیا تھا اور مدتوں صنم خانہ رہنے کے بعد پھر ایک حبشی نژاد کے نغمہ توحید سے گونج اٹھا۔ اور یہ وہی اذان ہے جو دنیا کے گوشے گوشے میں پانچ وقت لوگوں کے دلوں میں حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی یاد تازہ کرتی ہے اور غیر مسلموں کی دنیا بدل دیتی ہے۔ پچھلے دنوں اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی ہے اس کا عکس ملاحظہ فرمائیں۔

"اذان نے میری دنیا بدل دی"

کینیڈین پاپ اسٹار مسلمان ہوگیا

ٹورنٹو (اے این این) کینیڈا کے پاپ اسٹار لونگ براؤن نے جدہ میں اسلام قبول کر لیا اب اس کا اسلامی نام محمد رکھا گیا ہے پاپ اسٹار کینیڈا میں مائیکل جیکسن کے بھائی جمی جیکسن کے ساتھ شو منعقد کیا کرتا تھا وہ جمی جیکسن کے اسلام قبول کرنے کے بعد لفظ اسلام سے پہلی دفعہ مانوس ہوا۔ براؤن کی پیدائش اور پرورش خالصتاً کیتھولک گھرانے میں ہوئی جمی جیکسن کے حج بیت اللہ کی

باقی صفحہ 18 کالم 5 پر



مسلمان ہوگیا

ہوانجی کے بعد سعودی عرب سے اسلام کے موضوع پر آئی کتابوں کے مطالعہ کے بعد اسلام کی جانب راغب ہوا اور اتفاق سے اپنی والدہ کے پاس نیویارک گیا جہاں اسکی قیام گاہ کے قریب ہی پانچ وقت بلند آواز سے اذان کی آواز میرے دل کی دنیا میں ہلچل مچانے لگی اس کے بعد شوق کی رفتار مجھے مصر اور سعودی عرب لے گئی جہاں میں نے نہایت قریب سے مسلم معاشرے اور ماحول کا مطالعہ کیا بالآخر میں نے اسلام قبول کر لیا۔

اور آج حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی یاد کا یہ عالم ہے کہ انڈونیشیا میں بلال کا لفظ مؤذن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور امریکہ کے سیاہ فام کے اکثر مسلمانوں نے اپنا نام بلالی رکھا ہوا ہے۔

ہمارے یہاں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے لکھا تو اتنا گیا ہے کہ جتنا لکھا جانا چاہیے تھا البتہ ہمارے یہاں پڑھنے کا ذوق اور شوق نہیں ہے پڑھائی کے لیے جستجو اور سنجیدگی سے مطالعہ کا شوق ہونا ضروری ہے۔ صرف قہوہ خانوں میں بیٹھ کر چائے کی پیالی اور تمباکو نوشی کر لینے سے علم حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہی فضول قسم کا پراپیگنڈہ کرنے سے ادیب' شاعر' دانشور اور نقاد وغیرہ ہونے کی سند ملتی ہے۔ میں نے حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے بارے میں کم از کم چھ سات تراجم کئی ایک مضامین اور منظوم کلام پڑھا ہے بلکہ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ جام شورو کی اردو کی آٹھویں کتاب بھی میری نظر سے گزری ہے جس میں حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ پر ایک مضمون درج ہے۔ اصل میں ہمارے یہاں کئی ایک رواج ختم ہو گئے ہیں۔ جو کہ تعلیم کا ایک حصہ ہوتے تھے مثلاً" پہلے وقتوں میں مائیں اپنے بچوں کو رات سوتے وقت خصوصی طور پر اسلامی واقعات کو کہانی کی شکل میں سنایا کرتی تھیں جو کہ انہوں نے کتابوں میں پڑھا' یا سنا ہوتا تھا تاہم اس عمل سے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت اہم اثرات مرتب ہوتے تھے لیکن اب یہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اخلاقی انحطاط اور دینی عزت و اقدار سے بیزاری کی راہوں پر چل نکلے ہیں اور ہمارے رویوں میں تبدیلی آتی جا رہی ہے جبکہ نظام تعلیم کو موثر کرنے میں کوئی تبدیلی بروئے کار نہیں لائی جا رہی ہمارے یہاں تعلیم محض ملازمت اختیار کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی ہے ہر حکومت نظام تعلیم میں تبدیلیاں لانے پر منصوبہ بندی کرتی ہے اور یہ منصوبہ بندیاں دستاویز تک ہی محدود رہ جاتی ہیں۔ ہم روز بروز سماجی' اقتصادی اور ثقافتی پستی کی طرف جا رہے ہیں تاہم یہ موضوع ایک سیر حاصل گفتگو کا موضوع ہے لہذا یہ بات اس طرح سمیٹتا ہوں کہ ہم سب کو اور بالخصوص ماہرین تعلیم کو یہ باور ہو جانا چاہیے کہ تعلیم و تدریس کو محض ملازمت سمجھ کر اختیار کرنے والے کسی بھی تعلیمی پالیسی کو کامیاب نہیں ہونے دیں

گے جس طرح غالب نے کہا تھا کہ حسن پرستی بوالہوسوں کا کام نہیں اسی طرح تعلیم و تدریس میں ملازمت پیشہ لوگوں کا کام نہیں یہ سر پھروں اور جنونیوں کا کام ہے لہذا ہمیں پہلی ترجیح تعلیم اور تدریس پر بغیر کسی میعادی منصوبہ بندی کے دینی چاہیے تاکہ آنے والی نسل کو اعلی روحانی اور انسانی اقدار سے آراستہ کر سکیں۔

قرآن مجید میں اذان کو بلفظ "ندا" فرمایا گیا ہے۔ اور یوں قرآن مجید میں بھی اذان کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اذان کی ابتدا کیسے ہوئی اور اس کے اسباب و علل کیا تھے؟ اس بارے میں خاصا مواد اس کتاب میں مل جائے گا تاہم میں نے حدیث و فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے تئیں ان کتب سے جو کچھ مستند طور پر اخذ کیا ہے اسے مختصرا" بیان کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ ان کتب میں احکام کے سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ عورت اذان نہیں دے سکتی صرف بالغ مرد کو اذان دینے کا حکم ہے دوم جب اذان دی جائے تو سننے والوں کو چاہیے کہ اذان کے کلمات مؤذن کے ساتھ ساتھ خود بھی آہستہ آہستہ دہراتے جائیں لیکن چوتھا اور پانچواں کلمہ سنیں تو اسے دہرانے کی بجائے "لا حولہ ولا قوہ الا باللہ" کہیں۔ ثانیا" چونکہ اذان کے کئی الحان ہیں اسلیے مؤذن کا خوش آواز ہونا اور بلند آواز ہونا بہت ضروری ہے مؤذن ہونا ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ امام کے بعد دوسرا درجہ مؤذن کا ہے ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

الامام ضامن والموذن موتمن

امام ذمہ دار ہے اور مؤذن امانت دار ہے۔ دور مبارکہ میں حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ اجمعین موجود تھے جو اذان میں تقاضائے الحانی ۔۔۔ کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے مگر بات اعزاز و مرتبہ کی ہے کہ رب کریم جس کو عطا کر دیں چند ایک صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ جب صدائے اللہ اکبر سے آغاز کرتے ہیں تو لوگ گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ اور ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں اور بلال (رضی اللہ عنہ) کی آواز کے حسن میں بلا کی دلاویزی بھی ہے مگر بلال (رضی اللہ عنہ) اذان میں اشھد کو اسھد تلفظ کرتے ہیں تو

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلال (رضی اللہ عنہ) کی س بارگاہ الٰہی میں ش ہے لہٰذا یہ اعتراض اسی وقت ختم ہو گیا سیرت نگاروں لکھا نے ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اسی الحانی سے اہل دل کی زندگی وابستہ تھی اور مدینہ طیبہ میں اس آواز کے اعجاز کا عجب عالم ہوا کرتا تھا۔

اذان اور الحانی کیفیت

قارئین کرام! اذان کی الحانی کا ذکر آیا ہے تو اپنے کوچہ میں آباد تاریخی مسجد چینیانوالی کی اذان و اقامت میں الحانی کا چرچا برس ہا برس گزر جانے کے بعد آج بھی اس جہان رنگ و بو میں رچا بسا ہے۔ اس مسجد کے مؤذن قاری محمد اشرف اور محمد سلیمان آج بھی اذان دیتے ہوئے لحن کے تقاضا ہائے حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو پورا کر رہے ہیں۔ اس موقع پر محترم ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم و مغفور کا ایک مضمون یاد آگیا ہے۔ جو کہ اسی ضمن میں ہے۔ لکھتے ہیں کہ میری دینی تعلیم کا آغاز مدرسہ نعمانیہ لاہور میں ہوا لیکن نعمانیہ میں میرا قیام کچھ زیادہ نہ ہوا میں تھوڑے ہی عرصے کے بعد ایک دوسرے مسلک کے مرکز یعنی مسجد چینیانوالی میں آ پہنچا جہاں حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی رحمتہ اللہ کے درس میں شریک ہوتا تھا۔ اور مرحوم و مغفور حافظ محمد حسین (نابینا) سے مشکوہ شریف پڑھنے لگا۔ حافظ صاحب بطور مؤذن لاہور میں مشہور تھے ان کی اذان کی آواز قلب شہر سے چار اطراف حتی کہ شہر سے باہر مزنگ تک سنائی دیتی تھی۔ بڑی شخصیت کے مالک تھے میں اسی زمانے میں مولانا محمد داؤد غزنوی رحمتہ اللہ سے متعارف ہوا۔ یہ 21-1922ء کی بات ہے وہ اس زمانے میں امرتسر رہا کرتے تھے اور گاہے بگاہے اپنے بزرگ حضرت عبدالواحد غزنوی رحمتہ اللہ سے ملنے آیا کرتے تھے۔"

قارئین کرام! مسجد چینیانوالی اور مزنگ کا فضائی فاصلہ تقریباً" دو میل بنتا ہے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ وہ آواز — کس قدر بلند ہو گی۔ مؤذن کا بلند آواز اور خوش آواز ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی عظمت و کردار اور الحانی کے کیف و سرور سے واقف ہو۔ میں بفضل تعالیٰ اذان کے کیف و سرور سے

اب تک لطف اندوز ہو رہا ہوں۔اور روحانی تسکین سے فیضیاب ہو رہا ہوں۔

قارئین کرام! جب میری چشم ہوش وا ہوتی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ صبح سویرے اٹھنا ہمارے گھر کا دستور تھا محترمہ امی جان (اللہ تعالیٰ ان کا سایہ بھی مجھ پر سلامت رکھے۔ آمین) صبح کاذب ہی نماز فجر کے لئے جگا دیتیں جبکہ بچپن کی نیندیں بہت پیاری ہوتی ہیں اور بچپن کی نیندوں میں صبح کاذب بیدار ہونا اور پھر مجھ ایسے بچے کے لئے جس کی پرورش روز اول سے ہی ناز و نعم میں ہو رہی ہو بس **ایک خاص** عنایت کریمی ہی سمجھئے اصل میں میرے بابا میری ذات کے لئے ناز پروردہ ہونے کے ساتھ ساتھ مجھے انگریزی کے اس محاورہ پر سختی سے کاربند رکھتے تھے کہ۔

Early to Bed, early to rise Makes a man Healthy, wealthy and wise

میری اس تربیت کی پختگی کا عالم یہ ہے کہ ہنوز تاروں کی لو میں بیدار ہو جاتا ہوں جبکہ سارا جگ ایک سکوت کے عالم میں ہوتا ہے۔ ادھر فجر کی اذان شروع ہوتی ہے۔ اور ادھر میں اذان کی الحانی کے کیف و سرور میں محو ہو جاتا ہوں اور بعض اوقات اذان کی ترنم بھری آواز اور لے کاری سے رقت سی طاری ہو جاتی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ اس رقت آمیز کیفیت کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچو اس وقت وہ واقعہ یاد آگیا جو کہ سیر کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو شام میں رہتے ہوئے ایک مدت گزر گئی تو حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ فرما رہے ہیں۔ بلال (رضی اللہ عنہ) یہ خشک زمین کب تک؟ کیا تمہارے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ہماری زیارت کرو؟ اس خواب نے حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے دل کی دنیا میں ایک ہل چل پیدا کر دی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گزارے ہوئے شب و روز کے لمحات آنکھوں میں پھرنے لگے اسی وقت رخت سفر باندھا اور مدینہ طیبہ کی راہ لی۔ افتاں و خیزاں دیار حبیبؐ میں پہنچے پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ملنے کے لیے گئے۔ چمٹا چمٹا کر ان کو پیار کرنے لگے اور دلی سکون کا کچھ سامان فراہم کیا۔ باتوں باتوں میں دونوں جلیل القدر بھائیوں نے خواہش ظاہر کی کہ آج صبح کے وقت اذان دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جگر گوشوں کی فرمائش کو نہ ٹال سکے اور

اذان دینے کا اقرار کر لیا جب حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے اللہ کی عظمت و کبریائی کا کلمہ بلند کیا تو تمام مدینہ گونج اٹھا کوئی آنکھ نہ تھی جو آنسوؤں کے دریا نہ بہا رہی ہو۔ ارباب سیر کا بیان ہے کہ مدینہ میں ایسا پر اثر واقعہ نہ پہلے کبھی دیکھنے میں آیا تھا اور نہ اس کے بعد کسی نے دیکھا ہو گا۔

سو کچھ اسی طرح کی کیفیت اکثر و بیشتر مجھ پر وارد رہتی ہے۔ کبھی کبھار یہ آنسو چشم تر ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھار خشک آنکھوں میں سموئے رہتے ہیں۔ بہرکیف یہ لمحات مجھے راحت و سکون میسر کرتے ہیں۔ میری راحت اور سکون کا ایک سبب وقت سحر بھی ہے سحر خیزی بھی کیا خوب شے ہے۔

میں فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد طلوع سحر کی کرنوں کو دیکھتا ہو تو پہلے سے قدرے مختلف کیفیت میں دوچار ہو جاتا ہوں ،جسم و جاں میں تازگی اور توانائی سی محسوس کرتا ہوں سحر خیزی بھی بلا کی چیز ہے۔ سحر خیزی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ میں کئی ایک کاموں سے اطمینان کے ساتھ سبکدوش ہو جاتا ہوں مثلاً" تلاوت قرآن حکیم' صبح کی سیر اخبارات اور کتب کا مطالعہ اور غسل میرے معمولات میں شامل ہیں۔ اور مجھ پر فارسی کی مثل صحیح صادق آتی ہے "کہ سحر خیزی نشان فیروزی""نماز فجر ادا کرنے کے بعد تلاوت قرآن حکیم کرتا ہوں تو نماز اور قرآت میں جو خضو و خشو پاتا ہوں اس کے کیا ہی کہنے واقعی سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر78 میں بجا لکھا ہے کہ بے شک فجر کی قرآت بڑی ہی حضوری کی چیز ہے سحر کا ذکر ہوا تو قرآن حکیم کی سورہ القمر کی وہ آیت سامنے آگئی جس میں رب العزت نے فرمایا ہے۔انا ارسلنا علیھم حاصبا الا الی لوط نجینھم بسحر

ہم نے ان پر پتھراؤ کیا۔ سوائے آل لوط کے _انھیں ہم نے سحر کے وقت نجات دی تفسیر فاضلی میں اس کی تفسیر کا مفہوم کیا خوب بیان کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

""آل لوط میں وہ سب لوگ شامل تھے جو آپ پر ایمان رکھتے تھے اور عملاً" آپ کے ساتھ تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اپنی آل کو ساتھ لے کر بستی سے نکل جائیے اور سحر کے وقت نکلئے تب مجرم لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھئے نجات پانے والوں میں اس حال پر سب پاک لوگ شامل ہوتے تھے۔ جب

یہ لوگ بستی سے اس مقام پر پہنچ گئے جس کا انہیں امر دیا گیا تھا تو اللہ نے منکرین حق پر ایسا عذاب بھیجا جو اس سے پہلے کی قوم پر نہیں بھیجا گیا تھا اس قوم کا جرم بھی ایسا تھا جو اس سے پہلے کہیں نہیں تھا۔"

قارئین کرام! تفسیر فاضلی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ترجمہ اور تشریح کے بعد اس کا حاصل بھی دیا گیا ہے اور حاصل میں سحر کے بارے یوں لکھا ہے کہ

"سحر کا وقت پاک لوگوں کے جاگنے کا وقت ہے۔ مجرموں کے سونے کا وقت ہے۔"

مسجد چینیانوالی اور کوچہ چابک سواراں

مولانا داؤد غزنویؒ اور بانی ادارہ ادبستان محمد رفیق ملک مرحوم ومغفور

مسجد چینیانوالی لاہور کی ان مسجدوں میں سے ہے جن میں کاشی کاری بدرجہ کمال کی گئی ہے تاریخ لاہور کے مصنف کنیا لال ہندی لکھتے ہیں کہ عہد عالمگیری میں لاہور کا ایک فوجدار تھا جس کا نام نواب سرفراز خان المعروف افراز خان تھا اس نے یہ مسجد 1080ء ہجری میں تعمیر کروائی تاہم یہ عالی جاہ مسجد زمانہ سلف کی عمارتوں کی یادگار ہے اور کوچہ چابک سواراں میں واقع ہے۔ کوچہ چابک سواروں کا ذکر آ ہی گیا ہے تو اس کا تعارف ابھی بیان کرتا چلوں تاکہ مضمون کی روانی میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

قارئین کرام! یہ ایک تاریخی کوچہ ہے میں نے انگریز محقق و مورخ کی کتب میں بھی اس کوچہ کا ذکر پڑھا ہے۔ اس کوچہ کا نام پیشہ کے اعتبار سے رکھا گیا ہے۔ میرے ننھیال میں میرے نانا (الٰہی بخش) اور میرے ماموں (کریم بخش اور رحیم بخش) پیشہ کے اعتبار سے سوداگر اسپاں کہلاتے تھے بزرگ بتاتے ہیں کہ ایک زمانہ میں گھڑسواری کا کام خاصا منافع بخش ہونے کی وجہ سے بہت عروج پر تھا اور برصغیر کی بڑی منڈیوں میں اس کوچہ کا شمار ہوتا تھا۔ تو پیشہ کے اعتبار سے یہ کوچہ چابک سواراں ہو گیا پہلے وقتوں میں کوچہ و گلی اور بازاروں کا نام پیشہ کے اعتبار سے ہی رکھے جاتے تھے یا پھر کوئی تاریخی واقعہ رونما ہو جاتا اور اس میں جو واقعہ کردار کی شکل اختیار کر جاتا اسی نام سے منسوب ہو جاتا۔ اور اب آج کے زمانہ میں گلی اور بازاروں کے نام سرمایہ داروں جاگیرداروں اور بدعنوان لوگوں سے آویزاں ہوتے ہیں۔ حتی کہ بام وسقف کی تختیوں پر

بھی لفظ "ہذا من فضل ربی" لکھنے کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے زمانہ میں رشوت و چور بازاری کا بازار اتنا گرم نہیں ہوتا ہو گا جتنا کہ آج ہے بلکہ آج تو رشوت کا اس قدر برا حال دیکھنے میں آرہا ہے کہ یہ نامراد Perfect بھی نہیں رہی۔ تاہم کوچہ چابک سواراں کسی زمانہ میں ایک روایتی کوچہ ہوتا تھا اس کوچہ میں ہمارے ملک کی مایہ ناز شخصیتوں نے جنم لیا جن میں مصور پاکستان عبدالرحمن چغتائی' تحقیقات چشتی کے خالق مولوی نور احمد چشتی' ماہنامہ نرگس کے مالک مجید الملکی مسلم آوٹ لک کے ایڈیٹر و پبلشرز مولانا عبدالحق' لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس شیخ محمد شفیع' مسجد چینیانوالی کے ٹرسٹی اور معروف پبلشرز شیخ محمد اشرف' بانی ادارہ ادبستان اور روزنامہ کوہستان کے جنرل مینجر محمد رفیق ملک' فن طباعت کے ماہر اور مربیانہ طبیعت کے طبیب حکیم شاہنواز' پنجابی کے ممتاز شعراء شیخ غلام مصطفیٰ حیرت اور بابا ہدایت اللہ' سبزہ بیگانہ کے مصنف شیخ عبدالشکور' غازی علم دین شہید اور بہت سی باغ و بہار اور ماں جایا قسم کی شخصیات اس کوچہ کی آبرو تھے۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد "جب یہ لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہو گا" سو ادب' سیاست اور صحافت میں بھی یہ کوچہ برصغیرپاک و ہند میں خاصا معروف رہا ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ برصغیرپاک و ہند میں اردو لٹریچر کا آغاز اسی کوچہ سے ہوا تو حقیقت سے کچھ بعید نہ ہو گا۔ اور اس کوچہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ یہاں مسجد چینیانوالی آباد ہوئی۔

مسجد چینیانوالی کی جغرافیائی تاریخ اور اس عمارت کا حسن و کمال تو اپنی جگہ مسلمہ ہے ہی مگر اس کی ماہیت اور شہرت کے پس منظر ہیں دینی مذہبی روحانی اور سیاسی شخصیات بھی کارفرما رہی ہیں۔ جنھوں نے اس مسجد کی رونق کو اس طریق سے دوبالا کیا کہ یہاں پر قرآن و حدیث کی تعلیم و تدریس کو فروغ ملا اور تاریخ عالم میں اس کا شہرہ ہوا۔ اس مسجد میں اپنے اپنے دور کے جید علماء کرام امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ میری عمر کوئی چھ سات برس کی ہو گی اور مجھے دھندلا سا یاد پڑتا ہے۔ کہ اس وقت اہل حدیثوں کے جید عالم دین مولانا محمد داؤد غزنویؒ اس مسجد میں خطابت کے فرائض ادا کیا کرتے تھے مولانا علیہ الرحمہ کے آخری دو خطبے میں نے

سنے تھے۔ جو کہ اب میری یاد سے نکل گئے ہیں البتہ ان کا پر نور اور چمکتا ہوا چہرہ ان کی بارعب میٹھی اور سریلی آواز میری یاد داشت و سماعت میں اب بھی محفوظ و مرتسم ہے مولانا علیہ الرحمہ کے اخلاص توکل اور ان کے توحید کے دل آویز واقعات میں نے بچپن ہی میں اپنے خاندان کے بزرگوں سے سنے ہوئے ہیں جو مجھے کچھ کچھ یاد ہیں اور ان کچھ کچھ واقعات کے لئے بھی ایک دفتر چاہیے۔ میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں لائبریریوں میں جا کر مولانا علیہ الرحمہ کی ادارت میں امرتسر سے شائع ہونے والا ہفتہ وار "توحید" کی فائلوں کا بھی مطالعہ کیا ہے ان فائلوں میں مجھے مولانا ابوالکلام آزاد مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا عبد الواحد غزنوی' مولانا اسماعیل غزنوی قاضی محمد سلیمان منصور پوری' مولانا محمد علی قصوری اور مولانا محی الدین قصوری بھی نظر آئے اور یہ سب مقتدر ہستیاں ایسی ہیں جو ہر بات میں آپ اپنی ثانی تھیں۔

مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ ممتاز عالم دین اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کے بانی مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ علیہ کے فرزند تھےاور میرے بابا مرحوم کہا کرتے تھے "کہ مولانا فطرتاً مستقیم تھے اور آپ کا خاندان مشہور سادات میں سے تھا بابا مرحوم اکثر سنایا کرتے تھے کہ مولانا سے کوئی پوچھتا ہے کہ کیا آپ سید ہیں تو مولانا فرماتے کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم سید ہیں لیکن عجم میں انساب ایسے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ سادات کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا لیکن یہ از راہِ انکسار تھا نسبتاً" سید ہی تھے۔ اور حسب نسب سے ایک خانوادہ تھے" اس خانوادہ سے میرے خاندان کی بڑی عقیدت وارادات رہی ہے اور اسی تعلق خاطر کی بناء پر میرے خاندان کے چند ایک بزرگ مسجد چینیانوالی کے ٹرسٹی بھی رہ چکے ہیں۔ جب کبھی بھی میں اپنے بابا مرحوم و مغفور کے حلقہ احباب میں جاتا ہوں تو وہاں بھی اس عقیدت و ارادت کے چرچے زبان زد عام ملتے ہیں۔ میرے بابا کے بہت ہی اچھے دوست محترم محمد اسحاق بھٹی صاحب (جو بقید حیات ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین) ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ننگے سر نماز پڑھنا مولانا داؤد غزنوی علیہ رحمہ کو ناگوار گزرتا تھا اور اس کی ایک مثال ملک صاحب مرحوم و مغفور ہیں کہ ایک مرتبہ مسجد چینیانوالی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ محمد رفیق ملک صاحب جو مولانا کے پرانے عقیدت مند اور ان سے خاصے مضبوط اور گہرے روابط رکھتے تھے

ان کی موجودگی میں مسجد آئے اور ننگے سر نماز پڑھنے لگے۔ جب ملک صاحب نماز سے فارغ ہوئے تو ان کو بلایا اور فرمایا ! ملک صاحب ایک بات عرض کروں ملک صاحب نے کہا' مولانا فرمایئے کیا ارشاد ہے! ننگے سر نماز نہ پڑھا کریں۔ حتی کہ طلبہ کو ننگے سر درس میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔

اسی طرح میرے بابا کے حلقہ محبین میں تاریخ آزادی برصغیر اور کاروان احرار کے مصنف محترم جانباز مرزا مرحوم و مغفور اپنے ماہنامہ تبصرہ میں میرے بابا کی رحلت پر ایک مضمون تحریر کرتے ہیں جس میں مقتدر ہستیوں سے بابا کی وابستگیوں کی نشاند ملتی ہے۔ اس مضمون کا فی الحال اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"11 جولائی 1931 کو اسلامیہ کالج کے حبیبہ ہال میں رفیق ملک سے میری ملاقات ہوئی یہ مجلس احرار کے سالانہ اجلاس میں شامل تھا۔ رفیق ان دنوں زندگی کی ابتدائی بہاروں سے گزر رہا تھا۔ رفیق ملک مجلس احرار کے سالانہ اجلاس کی ہر نشست میں شامل ہوتا اور ہر بار اس کی نگاہیں میری نگاہوں سے متصادم ہوتیں۔ بالاخر یہی ٹکراؤ رفیق زندگی بن گیا پھر اس رشتے پر سے بہار و خزاں کے کتنے موسم گزرے اس کا اندازہ 15 اپریل 1974 کو ہوا جب رفیق ملک خود اس رشتے کو توڑ کر چلا گیا۔

بیالیس 42 برس کی دوستی موت کے ایک ہی جھٹکے میں ختم ہو گئی۔ بیالیس برس کے گزرے ہوئے راستوں کو پلٹ کر دیکھتا ہوں تو رفیق ہر موڑ پر میرے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اس کی مسکراہٹوں کے ہیولے ہواؤں میں بادل بن کر مجھے محیط کر رہے ہیں۔ اس کی روشن روشن آنکھیں میرے اندھیروں میں روشنی پھیلا رہی ہیں۔ اس کی کشادہ پیشانی کی چمک میرے فکر کی رہنمائی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ سیاست کے مدوجزر پر رفیق کی نگاہیں میرے فکر کو آج بھی جواں کئے ہوئے ہیں۔

وہ ابوالکلام آزادؒ کا نقیب تھا۔ وہ امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کا ہمنوا تھا اس کے مذہبی جذبات میں داؤد غزنویؒ کے خون کی آمیزش تھی۔ اس کے چلن میں شرافت کو اس قدر دخل رہا کہ فرشتے اس کے دامن پر وضو کرتے رہے۔

رفیق ملک زندگی کی طرح موت کے دروازے پر بھی مسکراتے ہوئے گیا مگر اب احباب ہیں کہ رو رہے ہیں۔ اخبارات ہیں کہ موت کی خبر شائع کر رہے ہیں اور دل

ہے کہ رفیق ملک کی موت کا یقین نہیں کرتا خیر--- آج نہیں تو کل مان جائے گا۔"

قارئین کرام! جب میں اس کتاب کا ابتدائیہ لکھنے بیٹھا تو میرے ذہن میں یہ بالکل نہ تھا کہ یہ بند دریچے بھی وا ہونگے اور میرا بچپن میرا لڑکپن اور اچھے دنوں کی یادیں میرے سامنے آجائیں گی اور میرے بابا کی بھی یاد دلائیں گی میرے بابا بہت ہی شفیق انسان تھے اور ہر ایک کے رفیق تھے۔ میرے بابا جنھوں نے میرے ارمانوں کو ہر دم پورا کیا اور میرے ہی لئے ناز بھی اٹھائے اور پھر میری آورشوں کو جلا بخشی آج بابا کی شفقتیں اور وضع داریاں رہ رہ کر یاد آتی ہیں اور تڑپاتی ہیں۔

میں یہ کتاب بھی حسب دل خواہ اپنے بابا کی یاد میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ میرے لئے دعا کیجئے کہ رب کریم مجھے اشترالناس سے محفوظ رکھے۔

دعا کا طالب

متین رفیق ملک

مسئلہ جنس ونسل

نسل یا جنس کا مسئلہ ایسا اجتماعی و معاشرتی مسئلہ ہے جس کا ذکر نہ صرف اکثر و بیشتر معاصرین کی زبانوں پر رہتا ہے بلکہ ان کی تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ معاشرتی واجتماعی مسائل میں یہ مسئلہ سر فہرست ہے اور اولین قبائلی نظام کے ساتھ وجود میں آنے والا قدیم ترین مسئلہ ہے۔ اکثر مغربی مفکرین نسلی یا جنسی مسائل پر بحث کے دوران لفظ جنس کو سامی الاصل قرار دیتے ہیں اور اس کو ترجیحی طور پر عربی لفظ قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں یہ لفظ راس سے ماخوذ ہے جو انسانی اور غیر انسانی نسل کے (رؤس) سروں میں امتیاز بخشتا ہے۔ ابتدائی زمانہ میں قبائل کا باہمی اختلاف اور ان کا تفاخری جذبہ کلیتاً کسی شر پر مبنی نہ تھا اور نہ ہی ان کے مابین وجہ نزاع تھا۔ چنانچہ علماء و مفکرین میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو اجتماعی و معاشرتی تعلقات کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور انسانی آداب اور ابتدائی تعلقات کو کسی بھی مرحلہ میں وحشی اور اجڈ انسانی قبیلہ کے لئے بھی انتہائی ضروری خیال کرتے ہیں کیونکہ اسی تعلق کے باعث قبائل میں باہمی تجاوز اور تعارف پیدا ہوتا ہے قرآن پاک نے اس مفہوم کو سورۃ الحجرات میں اس طرح بیان کیا ہے "اے لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو قبائل اور خاندانوں میں اس لئے تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو چنانچہ وہ فرائض وواجبات جو کوئی قبیلہ اپنے بیٹوں یا قبائلی افراد پر عائد کرتا ہے وہ اسی دن کے لئے ان واجبات و فرائض کی اساس و بنیاد بنتے ہیں جو انسان اس کے بعد سیکھتا ہے خواہ یہ واجبات و فرائض اس پر خود اس کے قبیلہ کی طرف سے عائد کیے گئے ہوں، خواہ امت یا معاشرہ کی طرف سے یا مجموعی طور پر انسانیت کی طرف سے عائد کیے گئے ہوں حقیقت یہ ہے کہ انسان طبعی طور پر اپنے بعض ایسے خصوصی امور پر فخر و مباہات کا قوی جذبہ

اپنے اندر رکھتا ہے جو اس کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائے جاتے۔ چنانچہ بنی نوع انسان کا کوئی فرد جس طرح اپنے حسب نسب اور خاندان پر فخر و تمکنت کرتا ہے اسی طرح اس کے اندر اپنے مسکن و مولد مطعومات و مشروبات کے متعلق بھی اسی نوع کا جذبہ کار فرما رہتا ہے اور جس طرح زندگی کی حقیقتوں کے بارہ میں وہ دوسروں پر فضیلت کا دعویٰ کرتا ہے اسی طرح وہ اوہام و اساطیر میں بھی دوسروں سے سبقت لے جانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ غرضیکہ زمانہ قدیم سے نسل انسانی کا ہر فرد اپنے حسب و نسب اور خاندانی امتیازات پر فخر و مباہات کا ہمیشہ شکار رہا ہے اور فخر و تمکنت کا یہ جذبہ اس میں اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے جب اس کے خاندان یا قبیلہ کو عرصہ دراز تک معاشرہ میں غلبہ و اقتدار حاصل رہا ہو، اگر یہ غلبہ و اختیار اس کو موجودہ وقت میں بھی حاصل ہے تو وہ اس کو اپنے فخر و مباہات کی بہت بڑی دلیل اور علامت سمجھتا ہے اور اگر بالفرض اس کے غلبہ و اقتدار کا دور گزر چکا ہے تو بھی وہ اس کو اپنے خاندان و قبیلہ کی قدامت و نجابت اور کرامت و شرافت پر محمول کرتا ہے اور دوسرے کے غلبہ و اقتدار کو چندروزہ اور عارضی قرار دیتا ہے اور اس طرح وہ اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ فخر و مباہات کا مستحق اور اہل جانتا ہے خواہ موجودہ وقت میں اس کے حالات کتنے ہی زبوں اور خستہ کیوں نہ ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ دنیا میں ہمیں کوئی بھی قوم ایسی نہیں ملتی جو اپنے احوال و کوائف، حسب و نسب، قومی صلاحیتوں اور ملی امنگوں سے متعلق فخر و مباہات کے جذبہ سے عاری و خالی ہو۔

ایک شاعر کہتا ہے :۔ "میرے ہم وطن اگر مجھ پر ظلم بھی کریں تو مجھے محبوب ہیں" اور میرے گھر والے اگر مجھ سے بخل کریں تو بھی سخی اور کریم ہیں۔ شاعر نے اپنے اس شعر میں ہر حیثیت سے تمام حقیقتیں جمع کر دی ہیں خواہ وہ ان سے واقف ہو یا نہ ہو اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا وطن یا شہر ہی سب سے اچھا ہو اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ اس کے گھر والے دوسرے لوگوں سے اتنے زیادہ اچھے ہوں کہ وہ ان سے منسوب ہونے پر فخر کرے اور ان کی اچھی شہرت کو اپنے لئے اور اپنی شہرت کو ان کے لئے باعث افتخار سمجھے، ایک زمانہ وہ تھا جب قدیم مصری اپنے آپ کو انسان کامل سمجھتے تھے اس کے بعد مختلف شعوب و قبائل کا دور آیا جن کو اس زمانہ کے معاشرہ میں اگرچہ چھٹا درجہ نصیب تھا لیکن ان کے متعلق عام خیال تھا کہ وہ نہایت مہذب و متمدن انسان ہیں اور ان کے علاوہ باقی لوگ جنگلی اور وحشی ہیں

جن میں فہم وشعور کی سخت کمی اور تہذیب وحضارت کا فقدان ہے، علیٰ ہذا القیاس قدیم عربوں کو بھی اپنے بارہ میں یہ زعم تھا کہ وہ اتنے فصیح، بلیغ اور کریم النفس ہیں کہ ان کے ماسوا سب لوگ گونگے، بے شعور اور کم فہم ہیں جو کسی بات کو نہیں سمجھتے ہیں نیز ان میں اخلاق ومروت بھی نہیں ہے اور وہ حسب ونسب کے اعتبار سے بھی کسی مقام پر نہیں ہیں۔ یہی حال ایران، ہندوستان اور چین وغیرہ کے باشندوں کا تھا، غرضیکہ ساری دنیا میں شعوب وقبائل کے اپنے اپنے متعلق یہی خیالات تھے حالانکہ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو عادات واطوار اخلاق وخصائل، حسب ونسب اور اساسی اصل کے اعتبار سے سب ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ یہی طور طریقے موجودہ زمانہ کی مہذب ومتمدن قوموں میں آج بھی رائج ہیں اور اس لحاظ سے یورپ کے باشندوں کو دوسرے براعظم کے رہنے والوں پر ایک گونہ امتیاز حاصل ہے لیکن یہ جذبہ تفاخر خود ان میں بھی موجود ہے چنانچہ وہ ہم نسل، ہم عقیدہ اور ہم زبان ہونے کے باوجود خود اپنے قرب وجوار کی قوموں کے مقابلہ میں ایک دوسرے سے عادات واخلاق خاندانی شرافت وکرامت کے علاوہ قومی کارناموں اور اولوالعزمیوں پر تقابل وتفاخر کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ یورپی اقوام میں اٹلی، اسپین اور فرانس سے زیادہ کوئی قوم جذبہ وفخر وتمکنت میں بڑھی ہوئی نہیں ہے یہ قومیں زبان کے اعتبار سے بالعموم لاطینی زبانیں بولتی ہیں۔ عقیدہ کے اعتبار سے مسیحی ہیں اور جنسی اعتبار سے مخلوط النسل ہیں۔ لیکن ان سب قوموں میں ایک مشترک اور ممتاز قومی خصوصیت جس پر وہ سب سے زیادہ فخر کرتے ہیں ان کا گورا رنگ ہے اس کے علاوہ تمام براعظموں میں ایک منتخب اور مخصوص براعظم کی طرف ان کی نسبت بھی ہے جو ان کو بزعم خود دوسروں سے جدا اور ممتاز کرتی ہے ان لوگوں نے سفید رنگ یا گوری چمڑی کو تمام انسانوں میں اپنی تہذیبی عظمت رحمت خداوندی فخر وتمکنت اور علمی وتمدنی وترقی کا نشان سمجھا ہوا ہے، جدید انگریزی کے عالم وادیب جولیں ہکسلے نے سچ کہا ہے کہ علمی وتمدنی ترقی کے ان دعوے داروں سے بہت پہلے اور میلاد مسیح قبل انبیاء بنی اسرائیل میں سے اشعیاء نبی نے اپنے انچاسویں درس میں کہا ہے "اے جزائر کے رہنے والو اور اے دور دراز خطوں میں بسنی والی امتو! میری بات دھیان سے سنو" مجھے میرے رب نے پیٹ میں سے پکارا ہے، اس نے میرا نام ماں کے پیٹ ہی میں رکھا ہے اس نے میری زبان کو تیز تلوار کی مانند بنایا ہے اس نے اپنے ہاتھ میں مجھے چھپایا ہے اور مجھے نوکیلے تیر کی طرح بنایا

ہے اس نے مجھے اپنے ترکش میں چھپایا ہے اور اس نے مجھ سے کہا ہے اے اسرائیل تو میرا بندہ ہے میں تجھے بزرگی دوں گا" لیکن میں نے اس سے کہا" تو نے مجھے فضول بنایا اور میں نے اپنی قوت یوں ہی ضائع کر دی""لیکن میرا حق میرے میرے رب کے پاس ہے اور میرا عمل میرے خدا کے پاس ہے۔"

"اور اب میرے رب نے کہا اب پیٹ میں سے ایسا بندہ پیدا کر جو یعقوب کو رب کی طرف مائل کر دے اور بنی اسرائیل کو اس سے ملا دے خدا نے کہا تو کم ہی میرا بندہ ایسا بنے گا کہ یعقوب کی اولاد کو راہ راست پر رکھے گا میں اپنے رب کی عزت کروں گا اور وہ میری قوت بن جائے گا اس کے جواب میں خدا نے کہا میں نے تجھ کو تمام امتوں اور قوموں کے لئے نور بنایا ہے تاکہ تو ساری دنیا کے لئے میری طرف سے نجات بن جائے۔" غرضیکہ یہ تھی گوری قوموں کے لئے رحمت خداوندی کی وہ بشارت جو میلاد مسیح سے بھی سات صدی قبل بنی اسرائیل کو مل چکی تھی۔ اور جس پر وہ آج تک نازاں چلے آرہے ہیں۔ قومی فخر و مباہات کے یہ غیر منطقی اور غیر علمی نعرے دنیا میں آج بھی گونجتے ہوئے سنائی دیتے ہیں جنہیں ہم بچوں کی ان طفلانہ شیخیوں اور بچگانہ تعلیوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو وہ اپنے آباء و اجداد کے کارناموں ان کی دولت و امارت، مکانات و باغات اور اپنے ان شہروں قصبوں اور دیہاتوں کے بارہ میں کرتے ہیں جہاں وہ رہتے ہوں یا ان کی نشوونما ہوئی ہو اس سے معلوم ہوا کہ نسلی و آبائی نوع کا فخر بلاوجہ اور بلا سبب ہمیشہ قوموں میں جاری و ساری رہا ہے جس میں بالعموم منطقی قیاس فکر و شعور اور سنجیدگی و متانت کو بہت کم دخل رہا ہے پھر انیسویں صدی میں شعوب و قبائل کے درمیان علمی مباحث کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔ اور اس میں بہت سے موضوعات داخل ہو گئے، چنانچہ بشری و انسانی اجناس اور ان کی اقسام کے متعلق بھی خالص علمی نقطہ نگاہ سے گفتگو ہونے لگی حتی کہ اس بحث و مباحثہ کے نتیجہ میں پانچ ایسی اقسام دریافت ہوئیں جن سے بظاہر نوع انسانی کی جنسوں یا نسلوں کا تعلق معلوم ہے وہ پانچ قسمیں یہ ہیں۔

قفقاسی یا سفید جنس، زنجی یا سیاہ جنس، منگولی یا زرد جنس، گندمی یا ملایائی جنس، سرخ جنس یا براعظم کے قدیم اور اصلی باشندے،

بعض لوگوں نے اس کو مختصر کر کے تین قسموں میں محدود کر دیا ہے۔ زرد گندمی، اور سرخ اور ان تینوں کی ایک ہی اصل تسلیم کی گئی ہے۔ جو بظاہر معقول معلوم ہوتی ہے۔ ان

لوگوں نے ان فرقوں کو خصوصی اہمیت دی ہے جو نسلاً اور ورثہ میں ملتے ہیں یا نسل کے ساتھ منتقل ہوتے رہتے ہیں اور یہ وہ فرق ہیں جن کو حیاتیاتی فرق کہا جا سکتا ہے اس کے بر خلاف وہ لوگ اجتماعی و معاشرتی فرقوں سے جو کسب و اکتساب یا تقلید و اتباع سے حاصل ہوتے ہیں زیادہ بحث نہیں کرتے۔ لغت و زبان کے جرمن عالم میکس ملر نے اجناس کا درس بین اللغاتی مقابلہ و موازنہ سے حاصل کیا ہے، چنانچہ اس نے آریائی لغات کے کلمہ کو اپنی بحث کا موضوع بنایا اور اس موضوع کو از سر نو زندہ کیا ہے حالانکہ اس سے قبل یہ کام سر ولیم جونس بھی اٹھارویں صدی کے آخر میں کر چکا ہے میکس ملر نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندی فارسی زبان کے لہجے وسط ایشیا میں جس کو متقدمین آریانا کہا کرتے تھے ایک ہی گہوارہ سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ کہ نشاۃ اولیٰ میں ان کا تعلق ایک ہی قسم کی بشری اجناس سے تھا لیکن ان مباحث میں حصہ لینے والے علماء کے نزدیک آج یہ دونوں اقوال غلط ہیں۔ جیسا کہ جولین ہکسلے نے براعظم یورپ کی جنس کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ثابت کیا ہے بہرحال جرمن عالم نے محسوس کر لیا کہ چونکہ آریائی جنس کی دعوت عنقریب علمی غور و فکر کے دائرہ سے نکل کر سیاسی خواہشات کے تابع ہو جائے گی اس لئے اس نے اپنے قارئین کو اپنے کلام کی تفسیر و تشریح میں غلطی سے بچنے کی تنبیہ کی ہے اور اپنے بڑھاپے میں اس نے دوبارہ یاد دہانی کراتے ہوئے کہا ہے کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ "میں نے آریہ کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے لیکن اس سے میری مراد خون ہڈی گوشت پوست اور کھوپڑی نہیں ہے بلکہ اس سے میری مراد واضح طور پر صرف ایک اور ایک ہے اور اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو آریائی زبان بولتے ہیں اور جب میں ان کی طرف سے بولتا ہوں تو میں اس تشریح خصائص کی پیروی نہیں کرتا ہوں اور نہ ہی اس سے میرا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اسکندری نیویا کے نیلی آنکھوں والے اور زرد بالوں والے باشندے قاہر و جابر تھے یا مجبور و مقہور تھے اور نہ ہی اس سے میری مراد یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے ان گندمی رنگ والوں کی زبان اختیار کر لی تھی جو ان پر غالب آ گئے تھے یا اس کے برعکس کوئی اور بات تھی در اصل میرے نزدیک جنس و نسل کا وہ عالم جو آریائی عنصر آریائی خون آریائی آنکھوں اور آریائی بالوں کی بابت گفتگو کرتا ہے شدید علمی غلطی کا ارتکاب کرتا ہے جس طرح انیسویں صدی عیسوی مختلف حیثیتوں سے علم و فلسفہ اور سائنس کی صدی کہلاتی ہے اسی طرح علماء حیاتیات کی اصطلاح میں یہ صدی دور آغاز

ارتقاء کے نام سے مشہور ہے اور ان کے نزدیک اس موضوع میں بحث و مباحثہ اور آراء و اقوال کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان لوگوں کا قول یہ ہے کہ بشری اجناس کا تعلق ایک اصل یا ایک شاخ سے نہیں ہے بلکہ متفرق اصول سے ہے چنانچہ بندروں کی اعلیٰ نسل بشریت سفلی کے اجناس سے ہے اور منگول اور بندروں کی وہ سفلی نسل جو اورنج کہلاتی ہے ایک اصل سے ہیں اسی طرح زنجی گوریلے اور چمپینزی دوسری اصل سے ہیں، علمائے اجناس میں سے اس رائے کا حامی جرمن عالم ڈاکٹر ہرمن کلاتش ہے جو جرمنی کی بروسیلز یونیورسٹی میں پروفیسر ہے اس نے بیسویں صدی کے اوائل میں اپنی اس رائے کا اعلان کیا اور اس کی تائید میں اس نے اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں بندروں اور بنی نوع انسان کی اقسام میں مقابلہ کر کے بھی دکھایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی نہ صرف علمی مباحث کی صدی تھی جس کا اولین مقصد استعماری طور طریقوں سے کام لینا اور اساسی تنازعات سے فائدہ اٹھانا تھا، چنانچہ عیسائی مبلغین کے نسلی امتیازات کی تبلیغی اور جنسی عصبیت پر مبنی اسکولوں کی رپورٹ سے مذکورہ بالا امر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اس کے علاوہ پورے یورپ میں قائم شدہ تبلیغی اداروں نے واضح طور پر نہ صرف شمالی یورپ کے اجناس کا تمام بشری اجناس پر قومیت و برتری کا پروپیگنڈہ کیا بلکہ تہذیب و ثقافت اور علمی فتوحات کا تمام تر سہرا بھی ان اصل آریائی اجناس کے سر پر رکھا جن کا تعلق شمال سے ہے۔ اس بلند بانگ دعوے میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا فرانس کا ساٹھ سالہ آرتھر دی جوبینو تھا جس نے جرمنی کی قومیت بھی حاصل کر لی تھی۔ اس نوع کا ادعا کرنے والوں سے کبھی امریکہ بھی خالی نہیں رہا وہاں بھی سرخ سفید اور کالے گوروں کی نزاعی بحث کے علاوہ یورپ سے آنے والے مختلف نسلوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے مہاجرین مثلاً سیکسن اور لاطینی، شمالی اور جنوبی اقوام کے مابین جنسی عصبیت اور نسلی تفاخر کا جذبہ برابر کار فرما رہا چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس عقیدہ اور جذبہ تفاخر کے مشہور مبلغ (Lothrop Stoddard) اور (Madison Grant) تھے۔

رنگ دار لوگوں کی کراہت و نفرت گوروں کی افضلیت و برتری اور آریائی جنس کی فضیلت ہی ایک وجہ ان کی حقارت وذلت کی نہ تھی جو ان لوگوں نے گوری قوموں میں پیدا کر دی تھی بلکہ ان کی آزاد حکومت اور طبقاتی و معاشرتی مساوات بھی ان مبلغین کو بے حد ناپسند تھی اس میں شک نہیں کہ نپولین بوناپارٹ کی جنگوں کا بھی جرمن قوموں میں اس قسم کی

عصبیت پیدا کرنے اور ان کے دل میں بغض وعناد کی آگ کو ہوا دینے میں کافی دخل تھا اس لئے کہ یہی ان کے پاس اپنے دفاع کا سب سے بڑا ہتھیار تھا جس کے ذریعہ وہ اپنے قومی فخر و تمکنت کا دفاع لاطینی یا شمالی و جنوبی اقوام کے مقابلہ میں کر سکتے تھے نپولین بوناپارٹ لاطینی فرانس کا ایسا لیڈر تھا جو براعظم یورپ کے جنوب الجنوب کے نشیبی میدان میں جرمنوں سے معرکہ آرائی کر سکتا تھا۔ غرضیکہ فخر و مباہات کا وہ نعرہ جس سے پوری جرمن قوم کو وحدت کی لڑی میں پرویا جا سکتا تھا ان کا جنس شمالی کی طرف منسوب ہونا تھا اور یہ ایسی خصوصیت اور فضیلت تھی جو جرمنی کے ہر باشندے کے لئے قابل فخر اور باعث عظمت تھی اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ زمانہ وہ تھا جب عام طور پر یورپ و امریکہ کے لوگ جنس و نسل کی بحثیں کرنے استعماری حربوں کے آزمانے اور جمہوری نعرے بلند کرنے میں بہت مشغول تھے تو جرمن ان باتوں میں اپنے دوسرے پڑوسیوں کے مقابلہ میں نسبتاً بہت پیچھے تھے اس لئے انہوں نے جرمنوں کی جنسی تفوق کا نعرہ بلند کیا اور نسلی برتری کا سہارا لیا۔ آریائی جنس کے تفوق و برتری کا انحصار میکس ملر کی تشریح کے بموجب انگریزی ممالک میں پیدائش پر ہے یہی وجہ ہے کہ نسلی تفوق کے نادر دعوے کا تعلق ماضی قریب اور ماضی بعید میں کبھی جرمن تہذیب و ثقافت سے نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۸ء کی پہلی عالمگیر جنگ کے متعدد اسباب نے جرمنی کے لیڈروں کے دعویٰ آریہ، مسئلہ نسل یا شمالی اقوام کے جملہ یورپی و غیر یورپی اقوام پر فخر و غلبہ کے دعوؤں کو خلط ملط کر دیا تھا۔ اس لئے جرمنی کے لیڈروں نے اشتراکیت سے لڑائی لڑنے کے لئے خود کو تیار کیا اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے ملک میں نیشنلزم اور قوم پرستی کو فروغ دینے کی سر توڑ کوششیں شروع کر دیں تاکہ اپنے ملک کو کمیونزم اور اشتراکیت کے حملوں سے محفوظ رکھ سکیں جو وطن و مذہب دونوں کا دشمن ہے، اشتراکیت اور کمیونزم کی اس لڑائی میں خوش قسمتی سے جہاں اہل جرمنی کو ان کی قومی خصوصیات اور کردار سے مدد ملی ان کو جرمنی کے دو مضبوط قوی مذہبی عناصر سلافیوں اور تیوتونوں کے مابین کشمکش اور چپقلش کے فقدان سے بھی ملی۔ جو بڑھ بڑھ کر ڈینگ مارتے تھے کہ صرف وہی لوگ زمانہ حال میں ایشیا کی طرف سے حملہ آور بربروں کے مقابلہ میں یورپی تہذیب و تمدن کے محافظ اور پاسبان ہیں۔ بہرحال سامی کہلانے والے یہودیوں کے خلاف جنگ میں اہل جرمنی کو دوسری چیزوں کے علاوہ آریائی نسل کی دعوت کچھ زیادہ مہنگی پڑی اسی

طرح بعض دوسرے اسباب ووجوہ کے علاوہ میدان جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد اہل جرمنی کے نخوت وغرور کے جذبہ کو سہارا دینے اور ابھارنے کا کام بھی خاصا مہنگا پڑا جس کی وجہ سے ان کو اپنے ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں میں جرات وہمت کی روح پھونکنے اور ان کو بار بار یہ جتانے کی ضرورت پیش آئی کہ وہ ہی فتح وظفر کے اہل ہیں عارضی ناکامی اور شکست کو اپنا مقدر نہ سمجھیں۔ اس لئے کہ وہ دنیا میں سروری اور سرداری کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اور ان کی آریائی نسل ہر قسم کی جنسی کھوٹ اور نسلی برائیوں سے پاک ہے ان کے دل ودماغ میں یہ بات بھی بٹھادی گئی کہ وہ بہت جلد اپنے دشمنوں پر غالب آجائیں گے بشرطیکہ اشتراکیت پسند افسران واہلکاران کی طرف سے خیانت کا ارتکاب نہ ہو نیز یہودیوں اور صاحب ثروت لوگوں کی جانب سے بھی خیانت وغداری نہ ہو۔

بہر حال اہل جرمنی میں عنصر ونسل کی بے لگام دعوت کم عقلی اور ناپختہ ہوس کا ایسا ہی نمونہ بن گئی تھی جیسا کہ صاحب عقیدہ لوگ تعصب اور کم ظرفی کا نمونہ بن جاتے ہیں چنانچہ ان میں آریائی خون اور نسل کا زعم اور جنون اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ وہ اسی کو حکومت کا فلسفہ اخلاق کی بنیاد واساس اور فنون وآداب کا مدار سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت زندگی کا ایسا تعمیری ڈھانچہ ہے جس کی آبیاری کے لئے قومی خون اتنا ہی اہم اور ضروری ہے جتنا جسم انسانی کے لئے اعضاء وجوارح ضروری ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ قوم کے رہنما اور لیڈر کو حکومتی ڈھانچہ کی تعمیر وساخت کی مضبوطی واستحکام میں خالق فطرت کی طرف سے بھی ہدایات اور تائید حاصل ہوتی ہے چنانچہ ہٹلر اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہم ایسا مغرور ومفتخر آریائی معاشرہ ہیں جو حکومت کو حیات ابدی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور اس کا ہمارے ارادہ سیاسی تربیت اور تدوین قانون وانتخاب میں کوئی دخل نہیں ہے۔

غرض کہ اسی قسم کی شدید عنصریت اور نسل پرستی کے پر غرور دعوؤں نے متعدد نفسیاتی اور سیاسی اسباب کے ساتھ مل کر ان کو غلو ومبالغہ کی اس خطرناک حد تک پہنچا دیا تھا جہاں تک کہ زمانہ ماضی میں کسی کا وہم وگمان بھی نہیں گیا تھا وہ اجناس بشری کی طبقات در طبقات تقسیم کو اس حد تک لے گئے تھے کہ انہوں نے انسان جیسی اشرف المخلوقات کا رشتہ بندروں کی ارذل ترین قسم سے جوڑ دیا تھا۔ لیکن وہ خود کو آریائی نسل کا منتخب پسندیدہ اور خاص الخاص گروہ کا حصہ سمجھتے تھے اور تمام ترصنعتی ترقی اور تہذیبی وتمدنی عروج کو آریائی نسل کے

مخصوص طبقہ سے منسوب کرتے تھے جو خواہ وطن میں مقیم ہو خواہ وطن سے دور کسی اور جگہ بحیثیت مہاجر مقیم ہو اور شاید عنصریت اور نسل پرستی کے دعوے داروں کے اس غلو و مبالغہ کی وجہ ہی سے اس طریق فکر کے نقاد کو اقوام و اجناس کی خصوصیات کے انکار کا موقع ملا ہے جس کے باعث انہوں نے ان کے تمام دلائل و براہین کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا ہے اب ہم ان اسباب و وجوہ کو پیش کرنا چاہتے ہیں جو جنس و نسل کے مسئلہ میں علمی حقائق کے ساتھ خلط ملط ہو گئے ہیں اس لئے کہ ان اسباب سے واقفیت و آگاہی حقائق علمی کو اجنبی اور نامانوس عناصر سے پاک و صاف کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو گی۔ اس کے علاوہ اس سے معقول بحث کی راہ ہموار ہو جائے گی اور فکر و شعور کے دائرہ کو بھی وسعت ملے گی۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہم اس یقینی دعوے کے شکوک و شبہات کے اسباب و دواعی کی طرف جو کہ بہت زیادہ ہیں، توجہ کریں کیونکہ حقیقتاً یہی اسباب نسل پرستوں کے دعوے میں شکوک و شبہات کو دعوت دیتے ہیں اور ان کے تمام عقیدوں کو باطل ٹھہراتے ہیں جن پر نہ صرف ان کا پختہ ایمان ہے بلکہ ان پر ایمان لانے کی ضرورت کا ان کو حد سے زیادہ احساس بھی رہتا ہے چنانچہ آریائی عنصریت یا نسلیت میں منجملہ دیگر اسباب شکوک کے ایک سبب یہ بھی ہے کہ مزعومہ آریائی عنصر کا وجود اس طرح کا قطعاً کہیں نہ تھا کہ گویا ان کے مزعومہ خیال کے مطابق منجملہ دیگر اعلیٰ موروثی نسلوں کے وہ خود بھی اعلیٰ مخصوص موروثی نسل اور برتر سلسلہ نسب سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس مژدہ میں کسی قوم کی تخصیص کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ اس میں تمام اقوام بلا اختلاف مرز و بوم شریک ہیں ان سب کو ایک اصل کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ عنصری یا نسلی خصائص میں قومیں صرف اسی انداز پر ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی ہیں جس طرح لوگ وطنوں اور رنگوں کے اختلاف کے باوجود ایک زبان بولتے ہیں۔

انگریز عالم جولین ہکسلے نے براعظم یورپ کی نسل یا جنس کی بابت گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ جنسیت و نسلیت کے مدعی صاحبان جرمنوں، آریوں اور شمالی اقوام کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ سب لوگ ایک ہی نسل سے ہیں یہ بات نہایت مشکوک اور حقیقت سے بعید معلوم ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک بشری نمونہ ایسا موجود ہے جو شمالی نمونہ کے نام

سے مشہور ہے اور جو یورپ کے شمالی اقطار و اکناف میں جزائر برطانیہ سے لے کر روسی سرحد تک پھیلا ہوا ہے لیکن یہ نمونہ جو پاکیزگی اور صفائی میں اسکنڈی نیویا کے بعض ممالک سے بہت کچھ مشابہہ ہے کبھی اپنی تہذیب و حصارت علمی تحقیق یا کسی تاریخی آلہ کی ایجاد کے لئے مشہور نہیں رہا مثال کے طور پر اگر تین ہزار سال قبل کے برطانیہ عظمیٰ کے پتھر کے دور کی طرف رجوع کر کے دیکھا جائے تو اس وقت کے برطانیہ میں ہمیں بحر ابیض متوسط کے دور کی وہ تہذیب نظر آتی ہے جس کو ان کے عزیز و اقارب نے اندلس میں پہنچایا۔ وہاں سے یہ تہذیب فرانس پہنچی اور فرانس سے برطانیہ عظمیٰ میں وارد ہوئی اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسان نے تہذیب و حضارت کی طرف اس وقت قدم اٹھائے ہیں جب اس نے کھیتی باڑی، تعمیر مکان اور نقل و حمل کے لئے پہیہ والی گاڑی کا استعمال شروع کیا اور اس کا آغاز بحر ابیض کے قرب و جوار میں ہوا جہاں گندمی رنگ کی وہ قوم آباد تھی جو شمالی اقوام کی نسل سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ اور یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ جرمنی کی مشہور و معروف ہستیاں مثلاً گوئٹے، بیتھوفن اور کانت جیسے لوگوں کے سر گول اور قدو قامت درمیانہ تھے نپولین، بوناپارٹ، شیکسپیئر آنسٹائن اور گلیلیو جیسے آدمی اس شکل و صورت اور ہیئت کے نہ تھے جیسا کہ شمالیوں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ زردی مائل سرخ رنگت اور خوب صورت کشیدہ قامت شمالی قومیت یا مزعومہ آریت کے کسی بھی دعوے دار لیڈر یار ہنما کا نہیں تھا۔ چنانچہ ہٹلر گندم گوں تھا، گوئرنگ تناور اور موٹا تھا، گوبلز پستہ قد اور بد شکل تھا اور بہر حال یہ لوگ تمام اقوام عالم پر جرمنوں کی سروری اور سیادت کے سب سے بڑے داعی کہلاتے ہیں۔ علماء اجناس اور اوصاف انسانی کے ماہرین کا جس طرح ایک خاندان میں نسلوں کی تقسیم پر اتفاق ہے اسی طرح ایک خاندان کی مکمل اور بے داغ اصلیت کی کمیابی و ندرت پر بھی ان کا اتفاق ہے۔ چنانچہ براعظم یورپ اور اس کے قرب و جوار کی سفید جنس اگرچہ ایک ہی عنوان کے ماتحت آتی ہے لیکن وہ نوردیہ، پیسہ ور بحر ابیض متوسط کی نسلوں اور خاندانوں میں منقسم ہے اور بحر ابیض متوسط کی یہ آخری نسل جو ایک ہی عنوان کے دائرہ میں آتی ہے ابیریا، لیبیا اور بلغاریہ کے رہنے والوں میں منقسم ہے اور سیاہ جنس والے تمام اجناس بشری میں ایک ممتاز نسل ہونے کے باوجود بعض صفات میں مختلف ہیں اگرچہ رنگ وغیرہ میں دوسروں سے ایک گونہ مماثلت بھی رکھتے ہیں کالے رنگ کے قبائل

اگرچہ آسٹریلیا میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن وہ افریقی قبائل سے اپنے موروثی عادات و خصائل میں بالکل مختلف ہیں یہی نہیں بلکہ وہ چہرے کے خدوخال اور اخلاق میں ان پڑوسی کالوں سے بھی خاصے مختلف ہیں جو براعظم افریقہ کے فرزندوں میں ہی شامل ہیں۔ چنانچہ بوشمان اور ہوٹنٹاٹ دونوں سیاہ فام افریقی قبائل ہیں۔ لیکن ان میں سے اول الذکر پستہ قد، اچھل کود کرنے والے شکار کے شوقین اور جدال و قتال کے دھنی ہیں جب کہ موخرالذکر قبیلہ کے لوگ بالعموم گڈریے اور چرواہے ہوتے ہیں۔ اور ان کے پڑوس میں ایسے حبشی النسل کالے آباد ہیں جو ان بانٹو قبائل کی اولاد ہیں جو جنوبی سوڈان کے علاوہ صحرا کے بعض ملکوں میں مغربی ساحلوں تک آباد ہیں۔ اور مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں سفر کا بندوبست کرنے والے، لڑنے بھڑنے والے، کاشت کاری کرنے والے ایک جگہ پڑاؤ کرنے والے اور صلح صفائی کرانے والے وغیرہ سبھی قسم کے لوگ شامل ہیں۔ اور ان کے مابین زبان اور لب ولہجہ کے فرق کی طرح ان کے خدوخال شکل وصورت اور اخلاق وعادات میں بھی باہم بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ تاہم ان متواتر مشاہدات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسانی نسلیں ہجرت وانتقال اور مسلسل کئی نسلوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ کبھی اپنی وحدت اور انفرادیت پر باقی نہیں رہتی ہیں بلکہ اپنی خصوصیات اور ترجیحات میں بھی ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہوتی چلی جاتی ہیں بہرحال اس بات سے نسل پرستوں کے اس دعویٰ کی قلعی کھل گئی کہ انسانی فضائل وخصوصیات کا انحصار صرف ایک ہی نسل میں ہے اور کبھی اس میں تبدیلی نہیں آتی ہے ان جنس پرستوں کے مزعومات وخیالات کے بارے میں ہمارے شک کو تقویت پہنچانے والی یہ بات بھی ہے کہ ایسی بہت سی فضیلتیں اور خصوصیات کے ذریعہ جو ان لوگوں کے نزدیک کسی خاندان کے ساتھ مخصوص ہیں ان مقامی یا اجتماعی عوامل کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے جن کا شمار وراثتی عوامل میں نہیں ہوتا اور ان سے ہماری مراد حیاتیاتی عوامل ہیں چنانچہ یورپی نسلوں کے بارہ میں ان کا یہ گمان کہ وہ نہ صرف معرفت نظریہ کی لگن اور محبت میں یگانہ روزگار ہیں بلکہ حقائق اشیاء کی بحث کا خوب ملکہ بھی رکھتے ہیں اور ان مجرد امور کے بارہ میں خوب خوب فلسفیانہ موشگافیاں بھی کرتے ہیں عام اس سے کہ اس سے انفرادی فائدہ مقصود ہو یا اجتماعی فائدہ، اسی لئے ان کا یہ خیال بھی ہے کہ شرقی شعوب وقبائل نہ معرفت علم سے کچھ زیادہ شغف رکھتے ہیں اور نہ ہی وہ فلسفیانہ مباحث میں

کچھ زیادہ کدو کاوش کرتے ہیں۔ البتہ علم سے تھوڑا بہت لگاؤ ضرور رکھتے ہیں تاکہ وہ اس سے اپنی صنعتوں میں کوئی ایسا مفید کام لے سکیں جو ان کی دنیوی زندگی میں ضروری ساز و سامان کی فراہمی میں ممد و معاون ہو سکے۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ اسرار غیب اور قوانین وجود سے بحث و تمحیص قوی و مضبوط کہانت کے دائرہ میں آتی ہے اور یہ قوی اور مضبوط کہانتیں ذہن انسانی میں راسخ ہو کر اپنا دائرہ عقل انسانی تک بڑھا لیتی ہیں جن کے باعث عظیم اور مستحکم حکومتیں بڑے بڑے دریاؤں کے ڈیلٹاؤں میں قائم ہو جاتی ہیں چنانچہ اگر ایک بڑا دریا کسی خطہ میں میسر آ جائے تو اس کے دونوں کناروں پر ایک عظیم سلطنت کا قیام لابدی سمجھا جاتا ہے۔ جس سے زراعت و باغبانی کو فروغ حاصل ہوتا ہے، چاروں طرف نظر کے سامنے حسین اور خوب صورت مناظر ہوتے ہیں، امن و امان کی راہیں کھل جاتی ہیں اور تمام قومی اور ملکی معاملات خوش اسلوبی سے طے ہونے کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ جب ایسی عظیم اور خوشحال ریاست قائم ہو جائے تو اس کی بقاء و استحکام کے لئے صالح ذہنی استعداد و رجحانات اور درایتی اصول کا سہارا لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے، اسی کے ساتھ کہانت کے فروغ معتقدات اور ذہنی رجحانات پر کنٹرول کرنے کے خیالات بھی حکمران کے دل و دماغ میں پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ دونوں کام ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ قدیم زمانہ میں بعض بادشاہوں کے ارباب انصاف اور اعیان حکومت کو حاصل ہوا کرتے تھے قدیم شرقی قوموں کی حکومتیں یونانی فلسفہ کے ظہور سے ہزارہا سال قبل کہانت کے بل بوتہ پر قائم تھیں حتیٰ کہ یونانی فکر و فلسفہ کا دائرہ اس حد تک وسیع ہو گیا کہ مشرقی کہانتوں کے افق پر منڈلاتے ہوئے سائے یونانی فلسفہ کے لئے سد راہ بن گئے۔ بہر حال اب یونانی ثقافت کا فرق کھل کر سب کے سامنے آ گیا تھا اور اگر سرزمین یونان نیل و فرات اور دجلہ کی وادیوں کے مابین اس کے برعکس معاملہ ہوتا تو بلاشبہ اس کے علائم و آثار اور نتائج ہی کچھ اور ہوتے۔

مذکورہ بالا حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ مضبوط و قوی کہانت نے یورپ میں پوری طرح جڑ پکڑنے کے بعد جو گہرے اثرات قائم کیے تھے وہ بالکل اسی قسم کے تھے جو شرق قدیم میں کہانتوں نے قائم کر دکھائے تھے چنانچہ جب کلیسا کے پوپ کے اثرات اور چرچ کی روایات یورپی اقوام پر پوری طرح چھا گئیں تو سب کے ذہنوں پر تالے پڑ گئے اور ان کی عقلیں

ایسی ماؤف اور بے کار ہو گئیں کہ وہ عرصہ دراز تک نظریاتی بحثوں میں حصہ لینے اور حقائق موجودات میں غور و فکر کرنے کے قابل نہ رہے اور یورپ کی کہانت اپنی جدیدیت کے باوجود قدیم شرقی کہانتوں کے اس درجہ و معیار کو پہنچ گئی جہاں وہ نسلاً بعد نسل عہد تاریخ کے آغاز کے بعد پہنچی تھی اسی طرح یورپ کے بعض عسکری ناقدین کے خیال میں یورپ کے لوگ شجاعت و بہادری اور میدان جنگ میں جوہر مردانگی دکھانے میں ایشیاؤں اور افریقیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں اور اس کے لئے ان کا استدلال یہ ہے کہ یونانی اپنی عددی قلت کے باوجود اہل فارس پر ان کی کثرت کے باوجود ماراتون اور سلامیس کے معرکوں میں فتح یاب ہوئے۔ جدید عسکری ناقدین نے مذکورہ بالا دونوں معرکوں کے متعلق وطنی فخر و مباہات کا نعرہ بلند کر کے جو طفلانہ کھیل کھیلا ہے اس میں غلو اور مبالغہ کے سوا کچھ نہیں ہے یونانیوں کو خیالی بہادری اور شجاعت کا لباس پہنا کر مستند تاریخ کے دائرہ سے نکال کر ہومری میدان جنگ میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

بہر حال دارا کسی دن بھی یونان کی سرزمین پر حملہ آور ہو کر اس کو فتح کرنے کا خیال اپنے دل میں نہیں لایا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یونان کی بنجر سرزمین نہ تو قابل زراعت تھی اور نہ ہی اس میں تجارتی کاروبار کے عمدہ مواقع تھے پھر اس کو اس ملک سے کسی قسم کا عسکری حملہ کا خطرہ بھی نہیں تھا، البتہ اس کی یہ آرزو اور خواہش ضرور تھی کہ وہ ارتیریا اور ایتھنس کو سبق ضرور سکھائے اس لئے کہ ان دونوں علاقوں نے یونان کی مدد کرنے کی جرات کی تھی اور یونان کو ایشیائے کوچک پر چڑھا کر لائے تھے چنانچہ اس نے اس موقع کو غنیمت جان کر ظالموں اور ایتھینس میں حریت کے طرفداروں اور حمایتیوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یونان کے متمرد و سرکش گروہ کی طرف سے دارا کا ساتھ دینے اور ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ اس نے ایشیائے کوچک کے انقلاب اور شورش کو سختی سے کچل دیا اور پھر اس کے بعد ارتیریا پر حملہ آور ہوا اور اس کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ اور وہاں کے باشندوں کو قیدی بنا لیا اور ان کو وہاں سے جلاوطن کر کے فارس کے ساحلوں کی طرف روانہ کر دیا جہاں ان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کیا گیا اس کے بعد وہ ایتھنس کی طرف روانہ ہو گیا اس کے اندازہ کے مطابق وہ آپس میں پھوٹ اور تفرقہ کا شکار تھے اور جلد از جلد ہتھیار ڈالنے کے لئے بے تاب تھے۔ اگرچہ ان

کی سپر اندازی کی یہ کوشش صرف چند گروہوں اوران کے لیڈروں کی جانب سے تھی، لیکن بہر حال جب یہ امر وقوع پذیر ہوا جس کی توقع نہ خود یونانیوں کو تھی اور نہ اہل فارس کو اور جب ایتھنس کے باشندے اپنے ملک کے دفاع پر متحد ہو گئے تو دارا نے محاصرہ کو طول دینا نہیں چاہا کیونکہ اس کا مقصد دراصل شہر کا سقوط تھا بھی نہیں۔ اس نے ان کی جانب سے وہاں ایسا کوئی ناپسندیدہ فعل بھی نہیں دیکھا تھا جس کے باعث ان کو ظلم و سختی اور دست درازی کا مستحق سمجھتا تھا۔ لیکن جہاں تک معرکہ سلامیس کا تعلق ہے اس میں کسی ڈپلومیسی یا تدبیر سے کام نہیں نکلا۔ اور آخر کار مقابلہ اور جنگ کی نوبت آگئی چنانچہ اہل فارس نے ماراتون کے معرکہ سے نمٹ کر مصری شورش دبانے کی طرف توجہ دی پھر اس کے بعد زرکسیس یونان سے جنگ کرنے کے لئے ایسا عظیم لشکر لے کر نکلا جس میں مختلف النوع نسلوں کے قبائل شامل تھے لیکن یہ لشکر اتنا بڑا بھی نہ تھا۔ جتنا یونانی اس کو سمجھ رہے تھے۔ بہر حال اس لشکر کی تعداد جہاں اطمینان بخش تھی وہاں مختلف اجناس اور نسلوں کے لوگوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے دارا کے کمانڈروں کے لئے قدرے باعث تشویش بھی تھی اس لئے کہ ایک ہی قبیل کے بڑے سے بڑے لشکر کی قیادت بہ نسبت اس لشکر کے جس میں مختلف الاجناس اور متنوع خواہشات رکھنے والے لوگ شامل ہوں، آسان ہوتی ہے علاوہ ازیں ان کو اس لئے بھی قدرے تشویش ہوئی کہ اہل فارس کا لشکر اپنے ایسے بحری بیڑے سے بھرپور رابطہ قائم کیے ہوئے تھا جس کی ڈیوٹی لازماً ساحل پر تھی اور جو حمل و نقل کا واحد ذریعہ اور اس کا واحد کفیل بھی تھا لیکن اب مشکل یہ درپیش تھی کہ لشکر اور بحری بیڑے کی ایک ہی گزرگاہ تھی جس میں ایک طرح سے دونوں پھنس کر اور قید ہو کر رہ گئے تھے اور اس حقیقت سے یونانی پوری طرح باخبر تھے چنانچہ جب دونوں بحری بیڑوں کا سلامیس میں آمنا سامنا ہوا تو اہل فارس کی کشتیوں کی کثرت اور ریل پیل خود ان کے اپنے بیڑے کے لئے سخت رکاوٹ بن گئی اور بجائے رحمت بننے کے زحمت کا باعث ہو گئی۔ اس لئے کہ پورے بحری بیڑے کا وہاں سمانا بے حد مشکل ہو گیا تھا حالانکہ زرکسیس نے اس طرف بڑھنے کا ارادہ ہی صرف اس لئے کیا تھا کہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ یونانی بیڑے کے کمانڈروں میں سخت بے چینی اور اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی حربی کونسل میں لڑائی کے میدان سے واپس چلے جانے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ بہر حال جب لڑائی شروع ہوئی تو قبل اس کے کہ یونانی کمانڈر

اپنی کشتیوں میں واپس چلے جاتے میدان معرکہ کی یہ بھیڑ بھاڑ خود یونانیوں کے حق میں رحمت اور بے حد مفید ثابت ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل فارس کے لشکر کو کھانا پہنچنا تقریباً ناممکن ہو گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل فارس کے بیڑے کی بہت سی کشتیاں اس معرکہ میں پہلے ہی ضائع اور تباہ ہو چکی تھیں نتیجتاً زرکسیس نے اس مقابلہ اور بحری جنگ سے دست کشی اختیار کر لی۔ حالانکہ وہ ایتھنس کی بری لڑائی میں فتح مند اور کامیاب ہو چکا تھا بہر حال اس میں شک نہیں کہ آج جو افتاد اہل فارس پر پڑی تھی ان معرکوں میں اگر یونانی بھی اسی پوزیشن میں ہوتے تو وہ بھی اسی مشکل صورت حال سے دوچار ہوتے جس کا سامنا اہل فارس کو کرنا پڑا تھا۔ تاہم سارا مسئلہ خاندانی نجابت و شرافت فضائل و مناقب اور قوم کے مرکز و معدن کے اختلاف کا نہیں ہے بلکہ اختلاف اموال و ملبوسات کا ہے اور جو لوگ لشکریوں اور فوجیوں کے جنسی و نسلی اختلاط کی آفت و مصیبت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور سارا زور ایرانیوں اور شرقیوں پر دیتے ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ صلیبی باوجود اپنی کثیر فوج اور یورپی نسل کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھنے کے شرقیوں کے ہاتھوں شکست فاش کھا گئے حالانکہ ان کا تعلق صرف ایک ریاست سے تھا اور اسلحہ اور جنگی تیاری کے لحاظ سے صلیبیوں سے کم تر تھے جب کہ ایسے تمام مواقع پر صلیبی فوجیں عقیدہ کی قوت و حرارت اور ملی و قومی وحدت اور فوجی تیاریوں میں کبھی کمزور نہ تھیں لیکن کیا اس کے باوجود آریہ کے انوکھے دعوے دار یہ کہتے سنائی نہیں دیتے کہ اہل فارس قدیم آریائی نسل سے ہیں اور وہ جنوبی یونانیوں کے مقابلہ میں شمالی اقوام سے زیادہ قریب ہیں چنانچہ فریڈرک ہرتز جیسا عالم بھی یاد دلاتا ہے کہ زنجیوں کا میل ملاپ اور اہل یورپ کے ساتھ ان کا اختلاط قدیم زمانہ میں بھی رہا ہے اور اگر اس سلسلہ میں ہم اپنی وہ تحریر نقل کریں جو ہم مفاخر اجناس کے سلسلہ میں اپنی کتاب "ساعات بین الکتب" کے دوسرے حصہ میں لکھ چکے ہیں تو شاید یہ بات کچھ اور زیادہ واضح ہو جائے۔

"زنجیوں کے جو آثار یورپ میں پائے گئے ہیں اس کا ثبوت وہ انسانی کھوپڑیاں ہیں جو المانیہ، بلجیکا، فرانس، کرواتیا اور مراقیا میں ملی ہیں جب کہ انہی کے مشابہہ کھوپڑیاں آٹھ سال ہوئے، جنوبی افریقہ میں بھی پائی گئی ہیں اور ان حقیر کالوں کے آثار و نشانات جبل آلپ میں بلینی کے عہد تک بھی باقی رہے ہیں جس نے ان حقیر کالوں کے بارہ میں بہت کچھ لکھا

ہے اور اپنے کلام کو ان کے افسانوں اور قصوں سے مزین کیا ہے۔"

چیمبر لین کا خیال تو یہ ہے کہ زندگی کے حقوق کا علم و عرفان دراصل آریوں کی خصوصیت اور فضیلت ہے جس کو کبھی سامیوں نے مشرق میں اس لئے متعارف نہیں کرایا کہ وہ مادی زندگی میں غرق ہو چکے تھے اور مال و دولت ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے اور دنیاوی سازو سامان اور اس عالم ناسوت کی چمک دار زندگی پر اس قدر فریفتہ تھے کہ نفس و روح کی تربیت سے قطعاً غافل ہو گئے تھے اس الزام کا مسکت جواب استاد ہرتز نے یہ دیا ہے کہ رومانوی شریعت اور حمورابی شریعت کے درمیان مفروضوں کے بارہ میں موازنہ و مقابلہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ رومانوی قانون کی تیسری تختی کی رو سے قرض خواہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مقروض کا گوشت جسم کے جس حصہ سے چاہے کاٹ لے اور اگر قرض خواہ کئی ہیں تو وہ گوشت آپس میں تقسیم کر لیں اس کے لئے وہ مقروض کو بیڑیوں اور رسیوں میں جکڑنے اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد ستائیس دن کی مدت میں کسی دن بھی قتل کر سکتے ہیں۔ لیکن حمورابی شریعت کے مطابق مقروض قرض خواہ کی تین سال تک خدمت بجا لائے گا اور حمورابی قانون اس خدمت کی مدت کے دوران اس کی جان کی حفاظت کا ذمہ دار ہو گا تاکہ مقروض کو کوئی ستانہ سکے اور نہ ہی اس کو ہلاک کر سکے اس کے علاوہ دونوں قوانین میں وہ واضح فرق بھی نوٹ کیا جائے جو دوسرے امور کی بابت دونوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ مضطر و مجبور چور کو حمورابی شریعت میں معذور سمجھا جاتا ہے جب کہ رومی قانون میں ایسا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہو گا اسی طرح رومانوی قانون میں باپ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی اولاد کو فروخت کر دے جب کہ حمورابی قانون اور بابلیوں کے نزدیک باپ کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں اسی طرح شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیوی کی مرضی کے بغیر کسی لونڈی کو خرید لے یا اس کو اپنے لئے منتخب کر لے، لیکن ایسا کوئی حق بیوی کے لئے رومی قانون تسلیم نہیں کرتا۔ علیٰ ہذا القیاس مقروض اپنے قرض خواہ سے اپنا قرض اس صورت میں کم بھی کرا سکتا ہے جب کہ اس کو کھیتی باڑی میں نقصان پہنچا ہو۔ لیکن رومانوی قانون مقروض کو اس قسم کا کوئی حق نہیں دیتا تاہم اسی طرح کے اور بہت سے امور میں جن سے حمورابی شریعت کے جذبہ رحم و کرم نیز دنیاوی سازو سامان کے مقابلہ میں زندگی کی اعلیٰ قدروں کا اظہار ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں رومانی قانون دنیا میں جبر و ظلم اور لوازمات حیات کو زندگی کی اعلیٰ قدروں پر

ترجیح دیتا ہے، مگر چیمبر لین یونان کو آسمان رفعت پر بلند کر کے کہتا ہے کہ یونانیوں کے علوم و فنون اور اس کے فلسفہ کا تعلق ان کے اس آریائی رجحان طبع سے ہے جو انہی کا امتیازی خاصہ ہے اور اسی کے باعث وہ ایشیائیوں اور سامیوں سے ممتاز ہیں۔ جس کا جواب ہر تزیہ دیتے ہیں کہ ارسطو کے زمانہ میں قدرت نے ایشیائیوں کو فنون میں جو کمالات بخشے تھے ارسطو خود اس کے بڑے مداح تھے اس کے بر خلاف وہ شمالی اقوام پر معارف فنیہ اور سیاست میں ایسے بانجھ پن کی بیماری کا الزام لگاتے تھے جو لاعلاج تھا علاوہ ازیں ہر تزیہ کا بیان ہے کہ یونانی مورخ ٹو سیدید نے لکھا ہے کہ پورا یونان کسی زمانہ میں بربر کے قبضہ میں تھا اور ہیروڈوٹ کا بیان بھی ہے کہ اس نے اپنے زمانہ میں بربری زبان اپنے وطن کے بعض علاقوں اور اطراف میں سنی تھی۔ اور بعض جدید علماء مثلاً کرشمر، کیلیخ اور فک نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ایشیائے کوچک اور یونان کے باشندے ایک ہی ایشیائی اصل اور نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ بعض یونانی مقامات کے نام اس زبان کے معلوم نہیں ہوتے وہ اسی طرح قدیم زبان کے مستثنیات معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں تمام اقوال اس امر پر متفق ہیں کہ فلسفہ یونانی کا سربراہ ارسطاطالیس ایشیائی اور سامی الاصل تھا اور اس کی تعلیم بھی مصری شہروں میں ہوئی تھی۔ اسی طرح مورخین کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ زینوں جو رواقی فلسفہ کا سربراہ کہلاتا ہے اصلاً ایشیائی تھا اور وہیں اس کی تربیت اور پرورش بھی ہوئی تھی بلکہ فیرث تو یہاں تک کہتا ہے کہ ہومر کا لفظ بھی سامی اور ایشیائی ہے اور "زومر" کا محرف ہے جس کے معنی مغنی اور گانے والے کے ہیں اس کے علاوہ دوسرے فلاسفہ کے بارہ میں بھی بہت سی باتیں لوگوں سے منقول ہیں۔ ہوتز نے کبھی کسی قبیلہ یا جنس و نسل کے ساتھ ناانصافی نہیں کی اس کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ منصفانہ اور مساویانہ رہا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے خیال میں کسی بھی دو قبیلوں کے احوال و کوائف ہمیشہ کسی نہ کسی حد تک مشابہت و یکسانیت رکھتے ہیں اس لئے ان کے بیان میں ممکنہ حد تک احتیاط برتنا لازمی ہے۔ چنانچہ ہنی بال رنجی جس کو پطرس اکبر نے منتخب کر لیا تھا اپنی خداداد ذہانت اور مسلسل کوششوں سے توپ خانہ کے انجینئر کے عہدہ تک پہنچا اور اس نے اشراف کے خاندان میں ایک شریف سردارہ خاتون سے شادی کر لی، خیال رہے کہ بوشکین جوان دونوں کا پوتا تھا روس کا سب سے بڑا شاعر اور دنیا کے بڑے شاعروں میں شمار ہوتا تھا اسی طرح ایک دوسرے شخص سلیمان زنجی نے بھی جو اٹھارہویں صدی میں

نمسوی دربار سے منسلک تھا ایک شریف سردار کی بیٹی سے شادی کی تھی اور خود اس کی بیٹی بھی ایک شریف سردار سے بیاہی گئی تھی علیٰ ہذاالقیاس ہیمبرگ کے ایک تاجر نے زنجبار کے سلطان کی بیٹی سے شادی رچائی تھی جو اپنے علم وادب اور ذہنی بیدار مغزی کی بدولت ایسے عروج پر پہنچی کہ جرمنی کے دربار میں اس کے مرتبہ واقبال مندی پر رشک وحسد کیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ وہ اثرورسوخ حاصل کرتے کرتے ایک دن فریڈرک کی ملکہ عالیہ کی گہری دوست اور رفیقہ وسہیلی بن گئی اور بالاخر اس کی ایک سوانح عمری بھی لکھی گئی جس کا عنوان تھا ''ایک عربی امیرانی کی کہانی''

تاہم جیسا کہ مشہور ہے ''اب زنجی خون دومس کبیر اور دوس صغیر کی رگوں میں دوڑ رہا تھا، ہرتز کہتا ہے ''تم کسی کو یہ کہتے نہیں سنو گے کہ سرخ حمص یا نیلے حمص یا سفید گھوڑے اور گندمی گھوڑے کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جو عبور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بنی نوع انسان کے مابین بالکل برائے نام فرق ہے اور وہ بھی توہمات اور قبائلی تعصبات کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے ان کے درمیان اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف ڈگری اور درجہ کا ہے جوہر اور اصل کا فرق نہیں ہے اگر کوئی شخص دوربین لگا کر بھی دیکھنا چاہے تو بھی اس کو یہی نظر آئے گا کہ بنی نوع انسان رنگوں کے بہت سے فرقوں کے باوجود طبعی طور پر قطعاً ایک ہیں اور مادہ کی یک رنگی کی بدولت تمام اقوام وامم کے افراد ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ ہرتز کی یہ ایسی معقول بات ہے جو کسی سند یا دلیل کی محتاج نہیں ہے اور یورپ کے ان دعوے داروں کے غلو اور مبالغہ سے بھرے ہوئے دعووں کی قلعی کھولنے کے لئے بالکل کافی ہے جو یورپی اقوام کی فضیلت و برتری کے قائل ہیں۔ تاہم تاریخی واقعات علمی مباحث اور عینی مشاہدات میں سے کوئی چیز بھی ان نسل پرستوں کی تائید نہیں کرتی ہے جو تمام نوع بشری اور انسانی جنس میں سے صرف ایک خاص نسل اور منتخب جنس کے خاندان کے لوگوں کو فضیلت وشرف اور رفعت و عظمت کا مستحق ٹھہراتے ہیں بہرکیف ایک کھلی ہوئی حقیقت کا انکار کرنا اور نسلی فخر ومباہات کے غیر حقیقی دعوے کرنا عقل وشعور کے سراسر خلاف ہے جس کی کبھی کسی علمی اور سنجیدہ طبقہ کی جانب سے تائید نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس سے عناصر واجناس اور نسلوں کے مابین موروثی جسمانی خصائص اور نفسانی کیفیات کے فرق واختلاف کی نفی بھی نہیں ہوتی ہے۔ یہ فرق ہمیشہ موجود رہے ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گے پھر بنی نوع انسان کے بعض افراد میں یہ

فرق کچھ زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور بعض میں کم، بہرحال اس نوع کے فرق سے کلیتاً صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی مختلف نسل و اجناس سے تعلق رکھنے والوں میں سے دو شخص اس قدر ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں کہ ایک مخلوق کے لئے بھی ان میں فرق و تمیز کرنا بے حد دشوار ہو جاتا ہے لیکن کسی ایک وقت میں ان کی مشابہت دوسرے تمام اوقات میں عدم مشابہت کے منافی بھی نہیں ہے، چنانچہ جب یہ کہا جائے کہ حیوان چارپاؤں پر چلتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی انسان بھی چارپاؤں پر چلتا ہو، اسی طرح جب یہ کہا جائے کہ حیوان بولنے پر قدرت نہیں رکھتا تو ممکن ہے کہ بعض انسان بھی گونگا ہو، علیٰ ہذا القیاس بعض پرندے ایسے ہی بولتے ہیں جیسے انسان بولتا ہے اور جب یہ کہا جائے کہ حیوان مسلوب العقل ہے تو ممکن ہے اس کے جواب میں بعض ایسے افراد پیش کیے جائیں جو عقل و فکر کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتے اور جب یہ کہا جائے کہ انسان اور حیوان اولاد پیدا نہیں کرتے، تو جواباً کہا جا سکتا ہے کہ کتا اور بلا حیوان ہونے کے باوجود اولاد پیدا نہیں کر سکتے، تاہم بعض افراد میں مشابہت عام افراد میں اس کے برخلاف ہونے کے منافی نہیں ہے، مقررہ علم کی زبان میں کسی چیز کی جامع و مانع تعریف بہت مشکل ہے لیکن اس کے باوجود جامع و مانع تعریف کا وجود بہرحال پایا جاتا ہے اس سلسلہ میں سب سے محفوظ و مامون طریقہ وہ ہے جس کا ہم گزشتہ سطور میں ذکر کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ بعض عناصر نے فضائل و اخلاق میں اپنی یکتا و انفرادیت کا جو دعویٰ کیا ہے وہ تاریخی علمی حقائق اور عینی مشاہدات کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اس لئے کہ ایسا دعویٰ ہمارے نزدیک دعویٰ بلا دلیل ہوگا لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ خصائص اجناس میں اختلاف ضرور موجود ہے اگرچہ بعض افراد میں اس کا ظہور مختلف درجات میں نظر آتا ہے۔ یہ امر مشاہدہ میں آنے کے علاوہ سراسر بدیہی بھی ہے کہ نسبی علیحدگی کا اثر عزت و وقار خانگی احوال و کوائف اور معاشرتی عادات و اطوار پر بھی پڑتا ہے، چنانچہ جو قوم سینکڑوں برس سے ہر قسم کے عوارضات کو دور کرنے، ہر طرح کے عوائق و موانع کا مقابلہ کرنے اور پڑوسیوں کی طرف سے ناگہانی حملوں کا دفاع و مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ دم آمادہ و تیار رہتی ہے وہ اس قوم کی مانند نہیں ہوتی جو ہمیشہ مصائب و آلام میں دوسروں کا سہارا لینے کی کوشش میں رہتی ہو اور خودکش مکش حیات میں سے حصہ لینے کی ہمت و حوصلہ نہ رکھتی ہو اور حتی الامکان مقابلہ سے گریزاں رہتی ہو جدید علم کے نقطہ نظر سے خلق

یعنی پیدائش اور خلق یعنی طبعی خصلت وعادت میں توارث کا تعلق ان جرثوموں سے ہوتا ہے جو مرد وزن دونوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ جرثومے ایک ہی قبیل کے افراد میں اسی طرح باہم متقارب ہوتے ہیں جس طرح ایک ہی خاندان کے افراد میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں لیکن یہ بات بالتحقیق آج بھی نہیں کہی جاسکتی ہے کہ کتنا وقت ان عوارضات کو جو خانگی حالات اور معیشت سے پیدا ہوتے ہیں ان موروثی چیزوں کے تبدیل کرنے میں لگتا ہے جو جرثوموں کی تکوین و تخلیق میں اور باپ دادا سے بیٹوں، پوتوں تک پہنچنے میں صرف ہوتا ہے اور نہ ہی بالتحقیق یہ بتاسکتے ہیں کہ نسلی جرثوموں کا اختلاف آیا گھریلو حالات اور معیشت کے طویل استقرار و استمرار کا نتیجہ ہے یا وہ تکوین و تخلیق میں اختلاف کے اصولوں میں سے کسی دوسری اصل کا نتیجہ ہے جو چیز ہمیں مشاہدہ سے صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی چہرہ کی فراست بہت سی چیزوں کا پتہ بتاتی اور بہت سی باتوں پر دلالت کرتی ہے اور یہ بھی ذہن نشین ہے کہ یہ دلالت پہلے مرتبہ میں قوی طور پر اعصاب سے مرتبت رہتی ہے اور اس کے بعد ہڈیوں سے، تم کسی قوم کی تاریخ سے کبھی دھوکا نہیں کھاؤ گے بشرطیکہ تم اس قوم کے فرزندوں کے چہروں کا بغور مطالعہ کرو اور اس بات کو ذہن نشین رکھو کہ وہ کم گوشت والا چہرہ جس میں گوشت اور خون کے خدوخال اعصاب اور ہڈیوں کے خدوخال پر غالب ہیں ایسی قوم کا چہرہ ہوتا ہے جو اپنے ماضی میں کم مصیبتیں اور صعوبتیں برداشت کرتی ہے اور کش مکش حیات میں بالعموم کم حصہ لیتی ہے ایسی قوم نفس و روح کی گہرائی اور دقت نظر سے بھی محروم ہوتی ہے اور اگر محتاط و دور اندیش چہرہ تمہیں گوشت و خون کی نرمی و نعومت کی طرف متوجہ کرنے سے قبل اعصاب و عظام کی متانت و سختی کی طرف متوجہ اور مائل کرتا ہے تو وہ اس قوم کے فرد کا چہرہ ہے جو مصائب میں ثابت قدم، اولوالعزم اور حوصلہ مند رہتی ہے۔ ایسی قوم کے افراد عرصہ دراز تک سہل انگاری اور عیش پسندی سے دور رہتے ہیں اور ہمارے لئے یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ چہرہ کی دور اندیشی کے خدوخال کیوں اور کیسے وراثت میں پہنچتے ہیں۔ بہر حال اتنی بات یقینی ہے کہ ایسی قوموں کے چہرے جن کے عزم و استقلال اور ہمت و حوصلہ کی مردانہ وار زندگی پر عرصہ دراز گزر گیا ہو ان قوموں اور امتوں کے چہروں اور بشروں سے مختلف ہوتے ہیں جن کی زندگیاں عیش و کامرانی اور سہولت و آرام سے بسر ہوتی ہیں، چہرہ کو دیکھ کر استدلال کرنا اور حالات کو تاڑ لینا تمام حیوانات کا طبعی خاصہ ہوتا ہے، ہم

دیکھتے ہیں کہ ہر حیوان سب سے پہلے اس حیوان پر ایک گہری نظر ڈالتا ہے جو اس کے بالمقابل کھڑا ہوا ہے کہ آیا وہ صلح و مصالحت کا خواہاں ہے یا اس سے لڑنے اور چیلنج کرنے پر آمادہ ہے اور اگر چہروں سے ایسی کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی جو دوسروں کے نفوس و عقل میں ہے تو دوسری طرف سے جو کچھ ان کے نفوس و عقول میں ہے اس کا اظہار بھی نہیں ہوتا ہے اور جس طرح مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے، علم سے بھی یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ اجناس کی خصوصیات عرصہ دراز تک وراثتاً اولاد میں پہنچتی رہتی ہیں خاص کر اس صورت میں اس کا اثر اور بھی زیادہ ہوتا ہے اور مدت تک باقی رہتا ہے جب کہ اولاد کی شادی بیاہ کے سلسلہ کا انحصار بھی ایک ہی خاندان یا وطن میں قائم رہے اس کے علاوہ بعض ایسے اجتماعی اور معاشرتی عادات و اطوار اور رسوم و آداب بھی جو افراد میں معیشت کی یکسانیت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ عرصہ دراز تک اسباب و علل کے زوال کے باوجود بھی باقی رہتے ہیں اور نتیجتاً اخلاف اپنے اسلاف سے یا اولاد اپنے باپ دادوں سے نقل و تقلید کے باعث یا تلقین و تعلیم کی بدولت اس سلسلہ کو برابر قائم رکھتی ہے۔

ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم تمام اجناس انسانی کی خصوصیات بیان کریں اس لئے کہ زنجی یا کالی نسل جس کا ہماری اس کتاب سے براہ راست تعلق ہے منجملہ اس انسانی اجناس کے ہے جو اپنی موروثی خصوصیات اور تقلید و معیشت کے اعتبار سے سب نسلوں میں ممتاز ہے اور جس میں دوسری پانچ یا تین اصناف اجناس کی بہ نسبت اوصاف میں کم اختلاف ہے اب ہم یہاں زنجیوں اور کالوں کی ان چند نسلی خصوصیات و اوصاف کا ذکر کریں گے جو علم الاجناس کی بعض کتابوں میں درج ہیں اور زنجیوں کی جن معاشرتی خصوصیات کا ہم کو علم ہے ان کے ذریعہ ہم بعض امور کی تصحیح اور بعض امور کا اضافہ بھی کر سکیں گے کتاب "الاجناس القدیم" کا مصنف ڈاکٹر سائیس لکھتا ہے بلاشبہ حبشیوں یا کالوں کا چہرہ لمبوترا اور نتھنے کشادہ ہوتے ہیں۔ ان کے رخسار بہت سخت مضبوط اور نمایاں طور پر ابھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی ٹھوڑی سکڑی ہوئی اور پتلی ہوتی ہیں ان کے ہونٹ موٹے بھدے اور دانت بڑے اور مسوڑھوں میں مضبوطی سے جمے ہوئے ہوتے ہیں ان کی عقل ڈاڑھ گو جلد نکل آتی ہے لیکن دیر میں ٹوٹتی ہے ان کی کھوپڑی پھیلی ہوئی اور بازو لمبے ہوتے ہیں ان کی پنڈلی کا گوشت موٹا اور بھدا ہوتا ہے ان کے پیر کی ہڈی پھیلی ہوئی اور انگوٹھا کڑا ہوا ہوتا ہے فنون کی طرف اس کا

میلان بالعموم کم ہوتا ہے البتہ وہ گانے بجانے کا بڑا دھنی اور عاشق ہوتا ہے، اس کی عادت یہ ہے کہ وہ احساس وشعور سے متاثر ہوتا ہے غور وفکر کی دعوت زنجی کو کچھ زیادہ متاثر نہیں کرتی کہا جاتا ہے کہ حبشی نوجوان چودہ برس کی عمر کے بعد کم ہی پیش قدمی کرتا اور سبقت دکھاتا ہے اس میں لطف ومہربانی کا جذبہ پایا جاتا ہے اور یہ دونوں **خصلتیں** اس میں قدیم زمانہ سے اس کی غلامی کے دور اور خدمت گاری کے زمانہ سے پائی جاتی ہیں۔ فراعنہ مصر کے پہلے خاندان کی طرف سے بہت سا سامان اور اشیائے خورد ونوش بھرتی کے شہروں میں غلاموں کی درآمد کے لئے بھیجی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں درآمد شدہ چیزوں میں سب سے بڑی تعداد غلاموں کی ہوتی تھی اور جیسا کہ انجیل کے باب دوم اور باب تیس میں مذکور ہے آرمیانبی کی جان جس شخص نے بچائی تھی وہ حبشی تھا اور غلام تھا اسی طرح کوشی بھی حبشی تھا جو اس یہودی کا دادا تھا جس کا ذکر انجیل باب چھ اور تیس میں آیا ہے۔

بہرحال مصری تہذیب کی طول وطویل صدیوں میں اگر حبشیوں نے کوئی کام انجام دیا تھا تو وہ لوہا پگھلانے کا کام تھا۔ مختصر یہ کہ بعض حبشیوں اور قبائلی زنجیوں کی معاشی زندگی میں پتھر کے زمانہ کے بعد لوہے کا زمانہ آیا اور دونوں زمانوں کے درمیانی وقفہ میں تانبہ وغیرہ کے زمانہ سے ان کو خلاف معمول کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ حبشی لوگ شدید ترین قسم کے روایت پسند مقلد مشہور ہیں اسی لئے وہ نہ صرف کبھی مصری تہذیب کے خلاف کسی رسم ورواج میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں بلکہ بوشمان کے ان قبائلی نوجوانوں کے آداب اور رسم ورواج کے خلاف بھی جانا پسند نہیں کرتے جو براعظم افریقہ کے اقصائے جنوب میں آباد ہیں اس لئے کہ انہیں ہر چہار طرف دیوار پر اس سانپ کے نقش اور تصویری خاکے بنے ہوئے نظر آتے ہیں جس کا حکم تمام بوشمانی قبائل پر چلتا ہے حتیٰ کہ یورپ کا رہنے والا حبشی آج بھی اس کی طرف منسوب ہونے میں کوئی شرم وندامت محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ جنوبی مصر میں ایسی ریتلی چٹانیں دیکھنے میں آتی ہیں جو جانوروں کے تصویری خاکوں سے آراستہ اور نقش ونگار سے پوری طرح ڈھکی ہوئی ہیں ان میں سے بعض بالکل نئی ہیں اور بعض بہت پرانی۔ ایک چٹان پر تو ایسے تصویری خاکے اور نقش ونگار بنے ہوئے ہیں جو پانچویں خاندان کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن آخری نقوش پر فضائی عوارضات کی وجہ سے تھوڑی تبدیلی محسوس ہوتی ہے حتیٰ کہ بادی النظر میں دیکھنے والے کو ایسا نظر آتا ہے کہ شاید یہ کام حال ہی میں انجام پایا ہے لیکن پہلے

رسوم کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر عرصہ دراز کا زمانہ گذر چکا ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ رسم و نشانات اور تصویری خاکوں کے علاوہ جس خاص جانور کا تصویری خاکہ اور نقش بار بار یہاں دیکھنے میں آتا ہے وہ زرافہ ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ اقلیم جو مصر کی تاریخ کے آغاز سے بالکل خشک تھی اس میں زرافہ کے تصویری خاکے اور نقش و نگار ہمیں اس قدیم ترین کی یاد دلاتی ہے جب یہاں کی سرزمین میں ایسی وسیع و عریض وادیاں تھیں جہاں بافراط پانی موجود تھا اور اس وادی میں خشک جیسے کانٹے دار درخت بکثرت ہوا کرتے تھے جنہیں زرافے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ ان تصویری خاکوں اور نقش و نگار میں جگہ جگہ راستے کے نشانات بھی اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح زرافے کے تصویری خاکے اور نشانات، یہاں ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ راستہ کے نشانات یا علامتی پتھر لگانے کا دستور مصری کتابت کے موجدین کے ابتدائی دور میں کچھ زیادہ معروف نہیں تھا اور سر فلاندرس نے بھی یہ کہہ کر کچھ کم حق تلفی نہیں کی ہے جب وہ اپنی جان چھڑاتے کے لئے یہ کہتا ہے کہ یہ رسوم و خاکے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے دراصل وادی نیل کے مصری اسلاف کے ماقبل تاریخ کی چھوڑی ہوئی باقیات میں سے ہیں اور اس کی اس رائے کی تائید شمالی افریقہ کے دوسرے علاقوں کے ان سیاحوں کے انکشافات سے بھی ہوتی ہے جنہیں اسی طرح کے رسوم و نشانات اور تصویری خاکے جنوبی تیونس اور مراکش میں بھی ملے ہیں بہر حال جہاں اس سے ایک حالت کی تقریبی تاریخ کا پتہ چلتا ہے اس سے غلط سمت میں پڑ جانے کا امکان بھی ہے۔ غرضیکہ ڈاکٹر بونیٹ کو جزائر کے شہر دہران میں پتھر کا وہ آلہ جس سے یہ نقش و نگار بنائے گئے تھے بعض مرتسم پتھروں کے نیچے پڑا ہوا ملا۔ اور اس سے تھوڑے ہی فاصلہ پر نیویوتی میں واقع ایک کارخانہ بھی دیکھنے میں آیا جہاں یہ آلات بنائے اور تیار کیے جاتے تھے اور اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ قدیم مصر میں جو حجری آلات بنانے کی جدوجہد کی گئی تھی آج انہی آلات نے عہد جدید میں نہایت عمدہ اور نفس ترین جدید آلات کا روپ دھار لیا ہے۔

پس مذکورہ بالا امور سے اس بات کا احتمال ہے کہ جس عہد میں صحرائے اعظم سرسبز و شاداب تھا وہاں بو شمانی نسل سے ملتی جلتی ایک اور نسل انسانی شمالی افریقہ میں اطلیسہ اور دریائے نیل کے سواحل کے مابین آباد تھی اور شاید قبائل اکاسین اور ان کے علاوہ وسط افریقہ

کے گول سر والے قبائلی بھی اسی قدیم ترین نسل کے باقیات معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو ان کے آبائی وطن سے زنجیوں اور حبشیوں کی غارت گری اور لوٹ مار نے جلاوطن کر دیا چنانچہ بانتویا کافر قبائل کی یہ غارت گری برابر جاری رہی حتیٰ کہ ان لوگوں کو انہوں نے افریقہ کے جنوب میں چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ لوگ اگرچہ اپنے دشمنوں سے جسمانی قوت و طاقت میں کمزور تھے لیکن ادبی خصوصیات میں یہ ان سے کسی طرح کم نہ تھے ان لوگوں کو ہر قسم کا فنی ملکہ حاصل تھا جو زنجیوں اور کافروں کو حاصل نہ تھا اور یہ ملکہ تصویری خاکے اور نقش و نگار بنانے کا تھا جب کہ حبشیوں کے بس کی یہ بات نہ تھی کہ تصویری یا نقش و نگار بنا سکیں یا بوشمان کے شہروں کی چٹانوں پر نشانات کی تکمیل کر سکیں اور جو پہاڑ صحرا کی شمالی جانب سے حد بندی کرتے ہیں دراصل وہی قدیم ترین اور دور افتادہ لوبین قبائل کا مولد و مسکن تھے اور ابھی ابھی ہم نے اس پہاڑ کی تعریف بیان کی ہے اور کہا ہے کہ اس نسل کی طرف منسوب ہے جو تمام سفید اجناس میں ممتاز و معروف ہے اور ہم نے اکثر و بیشتر انگلستان اور آئیر لینڈ کے دیہات میں ان قبائل کی شاخیں ان کی ظاہری خد و خال کے مطابق پائی اور دیکھی ہیں اور وہ پرانا نمونہ جو ہمیں ان قبائل میں دکھائی دیتا ہے ان مصری آثار و علائم کی تائید و توثیق کرتا ہے جیسا کہ اس کو اس کے وہ سفید خد و خال ظاہر کرتے ہیں جو آج تک علیٰ حالہ باقی ہیں۔

زنجی جنس کے اوصاف اور اس کی تاریخ کے بارہ میں ڈاکٹر سائس کی گفتگو بڑی حد تک قرین صواب ہے جس میں غلطی کا بہت کم امکان ہے یا بالفاظ یہ ان سب میں صحیح ترین بحث ہے جو اس موضوع پر ہو چکی ہے اور جو کچھ جدید اجناس کی بابت کتابوں میں اضافہ کر کے لکھا یا گیا ہے یا انسان کے دوسرے اوصاف کے بارہ میں لکھا گیا ہے وہ دراصل اسی موضوع کی قبیل تصحیح سے ہے یا قبیل تکمیل سے ہے اور ہم اسی کے متعلق ذیل میں مختصراً بیان کرتے ہیں۔

سیاہ فام لوگوں میں رنگ کی سیاہی ظاہری بشرئی کے ماوراء یعنی جسمانی کھال یا جلد کی گہرائی تک نہیں پہنچتی ہے تمام انسانی اجناس میں لوگوں کے جسم یکساں اور مساوی رنگ کے ہوتے ہیں رنگ کی سیاہی صرف انسانی کھال کی اوپری جھلی تک محدود ہوتی ہے جو کھال سے ملی ہوئی ہوتی ہے جسے ہم بشرہ کہتے ہیں۔ یہ سیاہی اس اوپری جھلی سے سرایت کر کے اندر کی سطح تک نہیں پہنچتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہم کھوپڑی کی تنگی اور وسعت کا مفہوم و مطلب بھی

سمجھانا چاہتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یورپین اقوام میں سفید جنس کی کھوپڑی نہ عام انسانی کھوپڑیوں سے بڑی ہوتی ہے اور نہ ہی ان قوموں کی کھوپڑی سے بڑی ہوتی ہے جو تہذیب و تمدن میں ان کے ہم پلہ نہیں ہیں اسی طرح اگر ہم دماغ کے قطر کا اندازہ کریں تو دماغ کے اگلے حصہ سے پچھلے حصہ تک قطر اگر سو ہے تو حبشی میں وہ ستر ہوگا اور یورپین میں اسی ہوگا اور مغربی جزائر کے باشندے یعنی سامیوں میں پچاسی ہوگا، علیٰ ہذا القیاس زنجی لوگ ہاتھوں کے لمبے ہوتے ہیں ان کے ہاتھ بعض اوقات اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ گھٹنوں تک پہنچتے ہیں ان کے بال اون کی طرح کے ہوتے ہیں جو تمام اجناس انسانی میں ان کی امتیازی اور خصوصی پہچان ہے لیکن جہاں تک اس قوم کی ثقافتی خصوصیتوں کا تعلق ہے تو ہمیں چاہئے کہ اس قوم کے تہذیبی طور پر پیچھے رہ جانے اور دوسری اجناس انسانی کے تہذیب و ثقافت میں آگے بڑھ جانے کے متعلق غور کرتے وقت یہ نہ بھولیں کہ اس قوم نے اتنی تہذیب و ثقافت حاصل کر لی جتنی اس کو ضرورت تھی، رہی عقلی طاقت اور قوت شعور تو یہ بالکل مختلف شے ہے اس کا تعلق تہذیب و ثقافت سے بالکل نہیں ہے اور اس میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہے ہر ایک زنجی یا حبشی ریاضی میں جمع جوڑ اور تفریق و ضرب کو سمجھنے میں اسی طرح اپنے ذہن کو کام میں لاتا ہے جس طرح ایک مہندس یا انجینئرنگ کا ایک طالب علم سمجھتا ہے اور پانچ کو پانچ سے ضرب دینے کا نتیجہ ایک مہندس اور انجینئر کے لئے پچیس ہوتا ہے ایک حبشی کو بھی اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے یا چاروں ہاتھ پاؤں کی انگلیاں گننے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

معلوم ہوا ہے کہ سیرالیون کے قریب آباد قبیلہ "الوی" کے ایک حبشی النسل شخص نے اپنی ضرورت کے مطابق ایک خاص طریق کتابت بھی ایجاد کیا ہے جس نے اس کو ان تمام اسالیب کتابت سے بے نیاز کر دیا ہے جو دوسرے متمدن شہروں میں رائج ہیں۔ جہاں تک فنون میں حبشی کی شرکت کا تعلق ہے وہ بھی اس کی طبعی ضروریات اور اجتماعی معیشت کے تقاضوں کے لحاظ سے کچھ کم نہیں ہے اور غالباً ہافلوک ایلیس نے اس قوم کے فنی ملکات کے متعلق مختصراً جو ریمارک لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے کہ "اس نے حضارت و ثقافت کا راستہ رقص کرتے ہوئے طے کیا ہے۔"

چونکہ رقص نغمہ کے بغیر نہیں ہوتا اور زنجی میں نغمہ کی ترنگ اور سریلی آواز کا جذبہ طبعی طور پر کچھ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو بے خود بنا کر رقص و سرور کی طرف شدت

سے مائل کر دیتا ہے وہ موسیقی اور گانے کا عاشق اور دلدادہ ہوتا ہے اور اس کے کان گانے کی آواز اور لے سے بے حد مانوس ہوتے ہیں اور وہ ایک دو بار سن کر ہی گانے کے بول یاد کر لیتا ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم موسیقی اور غنا کے ملکہ اور گویئے کے تصحیح سر کی کوششوں کے درمیان بعض ضروری فرقوں کو ملحوظ رکھیں۔ اس لئے کہ موسیقیت کی آوازیں تراکب و تنوع کے لحاظ سے اس درجہ پر پہنچ چکی ہیں جہاں وہ صحیح سر کے ساتھ مل کر فطری رقص یا رقص جدید میں حرکات جسم کا پورا پورا ساتھ دیتی ہیں۔ حبشی اور زنجی بالعموم رقص سے بھرپور گانے کو بے حد پسند کرتا ہے اور خود اس میں مہارت حاصل کرتا ہے چنانچہ عصری تاریخ میں اس کی یہ حیثیت معروف اور مسلمہ ہے اس سلسلہ میں حبشی رقص کا وہ واقعہ بھی یہاں یاد آتا ہے جو سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ کو اس حبشی کے رقص کو دیکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے بلایا تھا اور یہ حبشی اپنی تیز طراری، سبک رفتاری اور رقص میں متواتر و پیہم حرکت کے لئے بہت مشہور تھا۔ اور جب زنجی دوسرے فنون مثلاً مجسمہ سازی کی طرف راغب ہوا تو راگ اور سر کو درست کرنے کی کوشش اور رقص و سرود کی رغبت نے جو پہلا خیال اس کے دل میں قائم کیا وہ یہ تھا کہ یہ کام غنا اور رنگ سے بالکل مختلف اور جدا ہے، بہر حال اس کی بنائی ہوئی تمام تماثیل اور مجسمے اس کے ذاتی مشاہدات حیات اور ماحول کے اثرات سے خالی نہیں ہوتے۔ مجسموں اور تماثیل کی اشاعت رہن سہن کے مقامات کی ہو بہو یکسانت تصویری خاکوں، نشانات اور نقش و نگار سے آراستہ بنے ہوئے کپڑے وغیرہ زنجی و حبشی قبائل کی ایسی خصوصیات ہیں جن کو دیکھ کر کسی کو کوئی تعجب نہیں ہوتا ہے چنانچہ زنجیوں کے مجسمے خصوصیت سے خطوط و اشکال کا نادر نمونہ ہوتے ہیں۔ اس کو مجسمہ کے ابعاد ثلاثہ یعنی طول و عرض اور قرب و بعد کی صحیح تقلید میں قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ البتہ بعد واحد کی تقلید و تجسیم میں اس کو قدرے دشواری پیش آتی ہے۔ اس کی تماثیل اور مجسموں میں ہمیں ایک نئی جہت ملتی ہے جو اس کو دوسرے قدیم مجسموں میں معروف اور سب میں ممتاز کرتی ہے اور یہ جہت خوف اور تخویف کی ہے اور دراصل یہ بھی ایسی چیز ہے جس میں قطعاً کوئی ندرت و غرابت نہیں کیونکہ جب ہم زنجی کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہمیں وحشی درندوں خوفناک جانوروں زہریلے سانپوں اور

اژدھوں اور ارضی و سماوی آفات سے گھری ہوئی ملتی ہے حبشی کو اپنے بنائے ہوئے مجسموں سے جو سب سے بڑی غرض و غایت اور نفسیاتی تسکین حاصل ہوتی ہے وہ چہروں اور کھانے پینے کے برتنوں کو ایسے پراسرار اور مہیب طریقہ پر مشابہت بخشنا اور روپ دینا ہے جس سے وہ اپنے دشمنوں کو میدان جنگ میں سخت خوفزدہ کر کے دہشت میں مبتلا دکھا سکے، زنجی اور حبشی نے جدال و قتال کو بھی ہمیشہ ایک طرح کا فن سمجھا ہے کیونکہ اس میں بھی اس کو حرکات ریاضیہ رقص و سرود، سروں اور غنا کی ہم آہنگی کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے چنانچہ کسی زنجی، حبشی کی نظر میں جسمانی ریاضت سے زیادہ حسین اور دلکش منظر اور کوئی نہیں ہوتا جب کہ وہ بذات خود بھی جسمانی ورزش و ریاضت کا مجسم پیکر ہوتا ہے اسی طرح جب ایک زنجی تیر اندازی کرتا ہے تو اپنے دونوں کندھوں اور ہاتھوں کی وضع قطع، سینہ اور پیٹ کی وضع قطع کے مابین تقابل و موازنہ کرتا رہتا ہے چنانچہ اس کا تیر نشانہ پر ٹھیک اسی جگہ لگتا ہے۔ جہاں کا وہ نشانہ لیتا ہے۔ زنجی بہت بہادر اور شجاع ہوتا ہے وہ ہمیشہ خود پیش قدمی کرتا ہے وہ نہ کبھی موت سے ڈرتا ہے اور نہ مصائب و آلام سے اس کے قدم ڈگماتے اور پیچھے ہٹتے ہیں کوڑے اس کے غیظ و غضب کی آگ کو بھڑکا دیتے ہیں۔ زنجی اس کا خون پینے کو تیار رہتا ہے جو اس کی سرنگوں کرنا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے وہ بڑا صابر اور حوصلہ مند ہوتا ہے اور عزم و ہمت سے مصائب کا مقابلہ کرتا ہے وہ نہ گریہ وزاری کرتا ہے اور نہ کسی سے فریاد کرتا ہے وہ آفات و آلام سے فرار پر موت کو ترجیح دیتا ہے اور اس کو ایسی بزدلی سمجھتا ہے جو مردوں کے شایان شان نہیں ہوتی۔ جنگلی جانوروں، وحشی درندوں، خوفناک سانپوں، اژدھوں اور دائمی خطرات سے پُر زندگی نے اس کی عادات و اطوار پر زبردست اثر ڈالا ہے چنانچہ وہ ہمیشہ اپنے اوپر دشمن کے حملہ اور اس کے جبر و ظلم کا انتظار کرتا رہتا ہے یا دوسروں پر اسی قسم کے وار کا منتظر رہتا ہے۔ مصائب و آلام کی صورت میں جب اس کو حوصلہ مندی اور ہمت کے ساتھ صبر کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ تو وہ اس کو بزدلی اور نامردی سے تعبیر کرتا ہے اور مصیبت پر صبر کو اپنی ذلت اور عار سمجھتا ہے وہ سچ بولتا ہے اور سچ کی تصدیق کو کردار کی خوبی سمجھتا ہے وہ وعدہ کا پکا ہوتا ہے اور ان عقائد و رسوم پر دل سے یقین رکھتا ہے جو اسے اپنے اسلاف سے اور باپ دادا سے ورثہ میں ملتے ہیں اور جن سے اکثر کا تعلق جادو ٹوٹکے یا ارواح خبیثہ کی عبادت سے ہوتا ہے وہ تعویذ گنڈوں اور ٹونے ٹوٹکے کا بھی اس لئے بہت اعتقاد رکھتا ہے کہ یہ چیزیں

اس کے خیال میں اس کو ارواح کی ایذا رسانی سے محفوظ رکھتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس وفاداری اور عہد کی پاسداری بھی حبشی کی فطرت میں داخل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تربیت اور نشوونما ہی دراصل سردار قبیلہ کی اطاعت اور اس جادوگر کی اطاعت اور اس جادوگر کی خدمت واطاعت شعاری پر ہوتی ہے جو اس کو اپنے علم کے ذریعہ مصائب سے بچائے رکھتا ہے اسی طرح حبشی غداری اور خیانت کا بھی کم مرتکب ہوتا ہے بشرطیکہ اس کو یہ احساس ہو جائے کہ دوسرا شخص جو اس کا بار اٹھا رہا ہے اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آرہا ہے اور دوستی کا حق ادا کر رہا ہے لیکن وہ اس وقت خیانت و غداری سے بھی گریز نہیں کرتا ہے جب وہ کسی سے اپنے دل میں خوف محسوس کرتا ہے یا اس کا اطمینان قلب جاتا رہتا ہے اس وقت وہ خطرات کی اس زندگی کی طرف واپس لوٹ جاتا ہے جس نے اس کو ہمیشہ درندوں اور آفتوں میں رہ کر زندگی گزارنے کا عادی بنا دیا ہے یا پھر ایسے وقت میں وہ جادوگر کے ان پراسرار راہوں پر چل نکلتا ہے جو اس کے زعم میں مصائب و آلام سے نکالنے کا فن جانتا ہے غرضیکہ کسی زنجی و حبشی پر جب بُرے حالات طاری ہوتے ہیں تو وہ شدید مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے دل کا سکون چھن جاتا ہے تو اس وقت وہ ایسے حملہ آور کا کردار انجام دیتا ہے جو ہر طرف سے دھتکار دیا جاتا ہے اور بے یارومددگار چھوڑ دیا جاتا ہے چنانچہ ایسی حالت میں بے مہر دنیا کی مہر و محبت سے محروم ومایوس زنجی جو کچھ کر گزرتا ہے اس کے عواقب وانجام پر وہ قطعاً غور نہیں کرتا اس لئے ہمیں چاہئے کہ زنجی کی نگرانی کرنے اور اس کی عجیب وغریب حرکتوں کا جائزہ لینے سے قبل یہ نہ بھولیں کہ ہم اس عجیب مخلوق کا جائزہ لے رہے ہیں جو ہماری خصلت وعادت افتاد طبع اور خلقت سے بالکل مختلف ہے۔ دراصل ہم ایسی بہت سی چیزوں پر غرابت وندرت کا حکم لگا دیتے ہیں جو ہماری توقعات پر پوری نہیں اترتیں۔ اسی طرح ہم ایک کام اپنی اولاد، اپنی قوم یا اپنے ہم مشرب وہم زبان لوگوں کے ہاتھوں انجام پاتا ہوا دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے ہیں۔ لیکن اگر وہی کام کوئی اجنبی اور غریب الدیار شخص انجام دیتا ہے تو ہمارے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کو وحشیانہ اور غیر شائستہ کام قرار دے کر فیصلہ کر دیتے ہیں کہ ایسا کام صرف اسی قسم کا عجیب وغریب شخص ہی کر سکتا ہے، چنانچہ زنجیوں اور حبشیوں کے علاوہ دوسری عجیب وغریب اجناس کے لوگ اور ان کے احوال وکوائف بھی اسی لحاظ سے سب کو عجیب اور انوکھے معلوم ہوتے ہیں اگر لوگ چاہیں تو

جس طرح چھوٹے اجتماعات کے حقائق ملاحظہ کرنے کی طرف توجہ دیتے ہیں بڑے اجتماعات کے حقائق وواقعات ملاحظہ کرنے کی طرف بھی دھیان دیں۔ کیونکہ ہم تمام لوگوں کو تقریباً سب ہی مقامات میں بعض بدنام آدمی کے بارہ میں چہ میگوئیاں کرتے اور یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ اس کا اُون سُرخ ہے جس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص بھی وہی کام کرتا ہے جو دوسرا کرتا ہے اس کے بارہ میں لوگوں کی زبان سے یہ بات سنتے ہی لوگ دوڑ پڑتے ہیں اور اس شخص سے لوگوں کو ہوشیار اور چوکنا کر دیتے ہیں اور پھر اس کی برائیاں کر کے اس کو معاشرہ میں بدنام کر ڈالتے ہیں جب کہ ایک دوسرا شخص بھی بعینہ یہی کام کرتا ہے لیکن اس کو مطعون وبدنام کرنا تو در کنار رہا اس کے قبیح فعل سے لوگوں کو متنبہ اور ہوشیار بھی نہیں کیا جاتا ہے لوگ بالعموم اس وصف کو ان روایتی چرواہوں کی زبان سے مستعار لیتے ہیں جو سرخ بکری کے بچہ کو زجر و توبیخ کا نشانہ بناتے ہیں حالانکہ وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرتا جو سیاہ گور خر کے ریوڑ کے اس کے دوسرے بھائی بند نہ کرتے ہوں لیکن اس غریب کا عیب تو سب کو نظر آتا ہے دوسرے کا عیب کسی کو نظر نہیں آتا اس لئے اول الذکر غریب اکیلا سزا پاتا ہے جب کہ دوسرا سزا اور عتاب سے محفوظ رہتا ہے، بہر حال سیاہ فام حبشیوں کے اخلاق و عادات میں بہت سی انوکھی اور عجوبہ چیزیں پائی جاتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ زنجی کے معیار علم وفراست کی بابت دور از کار اور غلط نقطہ نظر سے بحث کرنے سے گریز کیا جائے ایک نسل یا قوم کی ضروریات اور اس کے تقاضے دوسری نسل اور قوم کی ضروریات اور تقاضوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم کو اسے زنجی کے علم و فہم کا تصور نہیں سمجھنا چاہئے اگر وہ سفید یا گندمی نسل کے لوگوں سے علم ہندسہ، فلکیات، طبعیات اور کیمسٹری میں پیچھے ہے اور اس کی اس پس ماندگی کی وجہ بالکل ظاہر ہے اس غریب زنجی کو کبھی اپنے ملک سے باہر نکل کر وسیع سمندروں میں سیر و سفر کرنے اجرام سماوی کی حرکات کا مطالعہ کرنے، علوم فلکی کو جاننے اور فضائی کیفیات کو سمجھنے کے وہ مواقع نہیں ملے جو دوسری قوموں کو میسر آئے ہیں اسی طرح اسے مضبوط قلعوں اور عالیشان عمارتوں کے بنانے اور اس سلسلہ میں پتھروں کی تراش خراش کے فن سے بھی کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا کہ وہ فن تعمیر کے اصول و ضوابط سے اسی طرح آشنا ہوتا جیسے دنیا کی دوسری قومیں ان سے آشنا ہیں۔ اس کو کبھی مانسونی ہواؤں کو پہچاننے، بارش کے اوقات کو

جاننے، پانی کی گزرگاہوں اور پلوں پر قابو پانے کی بھی کبھی ضرورت نہیں پیش آئی جس کے لئے اس کو علم ہندسہ کو جاننے، انجینئرنگ پڑھنے، جامد و سیال اشیاء عمدہ فصل اور قحط کے اسباب دریافت کرنے کی ضرورت پیش آتی اسی طرح زنجی کو کبھی غذائی اجناس کی پیداوار اور اس کی کوالٹی کو بڑھانے ملبوسات کو تیار کرنے ان میں تنوع اور خوب صورتی پیدا کرنے، نیز برتنوں اور آلات کی صیقل و آرائش کی بھی کبھی اس کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی کبھی اس کو کھانے پینے کی چیزوں کی حفاظت کرنے اور ان کو سڑنے اور خراب ہونے سے محفوظ کرنے کے طریقوں کے سوچنے کا خیال آیا اسی طرح اس کو جنگی و حربی آلات بنانے اور ان میں تنوع پیدا کرنے حربی فنون سے آگاہی حاصل کرنے کا احساس بھی کبھی پیدا نہیں ہوا ان سب امور سے عدم دلچسپی اور لاپروائی کا سبب ظاہر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تمام زنجیوں اور حبشیوں کی معاشی زندگی کا نظام معاشرتی طور طریقے جنگی چالیں، حملہ کرنے اور مدافعت کے طور طریقے انوکھے ہونے کے ساتھ بالکل یکساں ہوتے ہیں ان سب امور سے انہیں نہ صرف واقفیت ہے بلکہ ان میں مہارت بھی ہے اس لئے انہیں ایک دوسرے پر فوقیت و برتری حاصل کرنے اور جدید زمانہ کی جنگی تکنیک سیکھنے اور اسلحہ کے استعمال اور اسالیب جنگ میں سبقت لے جانے کا بھی کوئی صلہ اور جذبہ نہیں ہوتا زنجیوں کو اپنی تمام ضروریات زندگی بغیر کسی جدوجہد کے بآسانی ان کے مسکن اور اس کے قرب و جوار ہی میں مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مقاصد اسرار حیات کے متعلق باقی الجھنیں ان کا مقررہ جادوگر دور کرتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی اطاعت و فرماں برداری کریں اور اس کے اوامر و احکام پر بے چون و چرا عمل کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری زندگی اسی ڈھنگ اور نہج پر صدیوں سے یوں ہی گزرتی چلی آرہی ہے اور وہ اپنی اس زندگی سے پوری طرح مطمئن اور خوش ہیں جس میں اکثر و بیشتر ان کو جنگ و جدل تعویذ گنڈوں اور طلسماتی کرشموں کا معمولاً سہارا لینا پڑتا ہے ان کی زندگی کے یہ طور طریقے سالہا سال اور قرنہا قرن سے اسی طرح چلے آرہے ہیں اور وہ ان میں تبدیلی کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں آج جو قومیں علم ہندسہ و انجینئرنگ، ہیئت و فلکیات، فن تعمیر اور کیمیا سے واقف ہیں اور عیش و کامرانی کے سازوسامان سے آراستہ ہیں وہ ان چیزوں کے بغیر ایک دن گزارنے کا بھی تصور نہیں کر سکتیں اور اگر یہ لوگ براعظم افریقہ میں بودو باش اختیار کیے ہوتے اور اسی طرح کی زندگی کے عادی ہو گئے ہیں تو یہ بھی عیش و عشرت

اور مسرت و شادمانی کی اس زندگی کا تصور بھی کبھی نہ کر سکتے اور نہ ہی ان کے دل میں ان چیزوں کے بارہ میں کبھی خیال بھی آ سکتا، بہر حال اس میں شک نہیں کہ اگر زنجیوں نے بھی اسی قسم کی خوش حال اجتماعی زندگی گزاری ہوتی جیسی زندگی دوسری قوموں کے لوگ آج گزار رہے ہیں تو اسی قسم کی اختراعات و ایجادات کا سہرا ان کے سر بھی ہوتا جو موجودہ دور کی مہذب اور متمدن اقوام کا طرۂ امتیاز ہے۔ جہاں تک امراض کے علاج اور ادویہ کا تعلق ہے زنجی اسی فطری طریقہ علاج سے بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔ اور اپنے علاقوں میں پائی جانے والی جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے میں زنجیوں اور حبشیوں کو بڑی مہارت بھی تھی وہ نباتاتی طریقہ علاج کے علاوہ جادو ٹونکے وغیرہ سے نیز بذریعہ تنویم بھی علاج کرتے تھے۔

اگر ہم یہاں اس علمی و ادبی ثقافت کا تذکرہ کریں جس میں زنجیوں نے بھی اپنی استطاعت کے مطابق بھرپور حصہ لیا تو اس میں بھی ہمیں مایوسی نہیں ہوتی ہے بہر حال اس سلسلہ میں ان کو کوششیں کچھ کم قابل قدر نہیں تھیں انہوں نے علم و ادب کے میدان میں عمدہ کوششیں کیں ان میں عربی زبان کے چند ایسے فصیح و بلیغ اور مشہور شاعر مثلاً عنترہ، سحیم، عبد بنی حسحاس اور نصیب پیدا ہوئے جنھوں نے عمدہ رزمیہ شاعری کے ساتھ غزل و نسبب میں بھی شاعری کے جوہر دکھائے ان کی غزلوں اور گیتوں کا بڑا حصہ ایسا ہے جو مدت دراز تک عیش و نشاط اور رقص و سرود کی محفلوں کو گرماتا رہا ان شاعروں کا کلام آج بھی قدیم و جدید دور کے بڑے بڑے شاعر کے کلام کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید زنجیوں او حبشیوں کے ادراک و شعور کے فرق نے لوگوں کو ان کے بارہ میں اتنا گمراہ اور بدظن نہیں کیا تھا جتنا ان کے بجھے ہوئے سخت سیاہی مائل رنگ نے لوگوں کو ان سے برگشتہ و بدگمان کر دیا تھا ان کی عقلی اور خلقی کمزوری تو پہلے ہی لوگوں کو نظر میں کھٹکتی رہتی تھی ان کے ساتھ ہمیشہ جو بھی معاشی اور معاشرتی معاملہ کیا گیا اس میں نرمی اور رعایت کا پہلو کبھی لوگوں نے ان کے ساتھ اختیار نہیں کیا، غلاموں کی تجارت کرنے والے اور بردہ فروش ان کو بحر احمر، بحر ہند اور دریائے نیل کے راستے بلاد عرب او نہرین کے ملکوں میں اسی طریقہ پر پہنچاتے رہے جس طرح وہ ان کو مصر و یونان اور روم منتقل کرتے رہتے تھے ابھی قدیم دنیا پر جدید زمانہ کے انکشافات اجاگر نہیں ہونے پائے تھے کہ وہ سبائی علاقہ جو ہزارہا سال سے اس قدیم ترین قوم کا جدید اور آبائی مسکن تھا دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ چنانچہ جب اس سیاہ فام جنس کے

اخلاقی فضائل مثلاً وفا، صبر اور قناعت کا حال لوگوں کو معلوم ہوا تو ظالم بردہ فروشوں نے سیاہ فام زنجیوں کو امریکہ پہنچانا شروع کر دیا حتیٰ کہ انہوں نے چند سال بعد ریڈ انڈین کی یورپ کو منتقلی بھی قطعاً روک دی، اس لئے کہ ریڈ ایڈین کے بارہ میں ان کا تجربہ ناکام ہو گیا تھا اس لئے کہ وہ ان لوگوں سے جو اپنا مطلب نکالنا چاہتے تھے اس میں ان کی امیدیں پوری ہوتی نظر نہیں آرہی تھیں، قصہ کوتاہ یہ کہ سیاہ فام نسل کی تاریخ کے بارہ میں مختصراً جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ دنیا کی ایسی قدیم ترین جنس ہے جس کی قدامت کی تاریخ بہت پرانی ہے اور جو نہ صرف اپنی پیشتر تاریخ کے زمانہ سے اپنی روایات، عقائد اور اصولوں میں بہت زیادہ غلو رکھتی ہے بلکہ ان پر بڑے شدومد سے جمی بھی رہتی ہے یہ ایسی جنس ہے جس کی نشوونما فطرت اول کی حدود سے کبھی آگے نہیں بڑھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ براعظم افریقہ کی معیشت اور عام زندگی کی حالت ہی ہمیشہ ایسی رہی جس نے ان کو کشف علوم شہروں کی تعمیر و آبادکاری اور صنعتوں کی ایجاد و اختراع کی طرف کبھی مائل ہی نہیں ہونے دیا لیکن اس پستی، زبوں حالی اور اپنی حالت پر قانع اور صابر رہنے کے باوجود یہ لوگ ان فضائل و ملکات کے حصول سے کبھی غافل نہیں رہے جو ان کی معیشت اور مستقل بود و باش کے مسکن اور زندگی کی بقا کے لئے ضروری تھے چنانچہ وہ کشمکش حیات اور تنازع للبقا کے لئے مقابلہ سے کبھی دست بردار نہیں ہوئے، وہ اپنی تنگ دستی کی زندگی میں بھی اپنے نفس کی طمانیت اور سرخوشی کے لئے اپنے غیر معروف اور مجہول ایمان و عقائد پر بھی مستقل مزاجی سے جمے رہنے میں بڑی راحت اور خوشی محسوس کرتے تھے چنانچہ شجاعت، وفا اور آلام و مصائب پر صبر استقامت ان کے کردار کی اچھی خصوصیات ہیں لیکن قابل افسوس امر یہ ہے کہ اس بدنصیب قوم کے ساتھ انصاف کرنے اور رعایت برتنے کا خیال ہزارہا سال گزرنے کے باوجود دنیا کی مہذب اقوام میں آج تک پیدا نہیں ہوا، یہی وجہ ہے کہ صدیوں کے ظلم و استحصال اور انسانی حقوق کے غصب ہونے کے بعد انقلاب برپا ہونے کے آثار شروع ہوئے۔ اور انسانی حقوق کے تحفظ و مساوات کی ایک تحریک شروع ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں عیسائی مبلغین اور دوسری جماعتوں کی کوشش سے ایک کانفرنس جزائر برطانیہ میں منعقد ہوئی جس نے اقوام عالم کی توجہ نو آبادیات میں کالوں اور گوروں کے درمیان فرق و امتیاز دور کرنے کی طرف توجہ مبذول کرائی اور اس کی حمایت و موافقت میں برطانیہ کے گرجاؤں کی کمیٹی نے بھی اپنی آواز بلند کی اور امید ظاہر کی کہ تعلیم اور تماشہ شعبہ ہائے حیات میں تمام اقوام کے ساتھ بلا امتیاز

رنگ و نسل یکساں اور مساوی برتاؤ کیا جائے گا، یہ جنسی فرق و امتیازات امریکیوں کے مساوات کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی ہنوز قائم اور موجود ہیں۔ چنانچہ امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں کالوں اور گورے امریکیوں کے درمیان فرق و امتیازات ازروئے قانون اور حکومت کے احکام کے مطابق قائم ہیں ان قوانین کی رو سے نہ کالے امریکی عام سواریوں میں گوروں کے ساتھ برابر میں بیٹھ سکتے ہیں اور نہ وہ ریستورانوں اور ہوٹلوں میں قیام کر سکتے ہیں۔ اسی طرح جن اسکولوں میں گورے امریکیوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں وہاں کالوں کے بچوں کو اسکولوں میں داخلہ نہیں مل سکتا اور جب گوروں کے اسکولوں میں کالوں کے بچوں کے داخلہ کا قانون پاس ہوا تو اس قانون کے نفاذ کے بعد اس کی اصل حقیقت کھلی کہ یہ سب کچھ کاغذی کارروائی تھی۔ حقیقت میں کالوں کے بچوں کے ساتھ داخلوں میں اب بھی پہلا سا امتیازی سلوک جاری تھا۔ ہر گورے طالب علم کو قانون کے برخلاف جنوب کی نو ریاستوں میں تقریباً انسٹھ ریال سالانہ ملتے ہیں۔ جب کہ کالے اور حبشی طالب علم کو زیادہ سے زیادہ انیس ریال دیے جاتے ہیں اور میسپی ریاست میں تو یہ فرق کچھ اور زیادہ نمایاں طوز پر پایا جاتا ہے وہاں کی حکومت ہر گورے طالب علم پر باون ریال خرچ کرتی ہے جب کہ رنجی طالب علم کو صرف ساڑھے سات ریال ملتے ہیں امریکہ کی شمالی ریاستوں میں اگرچہ بہت سے ایسے قوانین تبدیل کر دیئے گئے ہیں جن سے کالوں اور گوروں میں فرق و امتیاز اور رسم و رواج برتا جاتا ہے۔ چنانچہ کوئی کالا یا زنجی کسی بڑے ہوٹل میں قیام کرتا ہوا نظر نہیں آتا اور نہ گوروں کی اعلیٰ اور شان دار دعوتوں میں وہ شرک ہو سکتا ہے خواہ وہ کتنا ہی صاحب ثروت کیوں نہ ہو۔ غرضیکہ مغربی تہذیب نے رنگ و نسل کے امتیازات رفع کرنے اور عدل و مساوات قائم کرنے کے لئے نہ کبھی بنیادی اقدامات کئے اور نہ عملاً ان کو نافذ کیا، اس کے برعکس اسلام دنیا کا وہ پہلا مذہب ہے جس نے آج سے چودہ سو سال قبل رنگ و نسل کالے گورے چھوٹے بڑے امیر و غریب اور عرب و عجم کی تمیز اٹھا دی اور بنی نوع انسان کے تمام افراد کو ایک سطح پر لا کھڑا کر دیا اسلام نے مادی زندگی اور اس کی اقدار کو روحانی زندگی کی اعلیٰ اقدار کے ماتحت کر کے ہر قسم کی اونچ نیچ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ ایک طرف اس عدل و مساوات کا نمونہ اس کتاب کی عظیم شخصیت حضرت بلالؓ بن رباح ایک غریب و ضعیف غلام تھے اور دوسری طرف حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ جیسے اسلام کے خلفاء راشدین تھے۔ اس کتاب کے مقدمہ کے بعد جو تاریخ اجناس و جنس

اسود کے بارہ میں تحریر کیا گیا ہے۔ حضرت بلالؓ کی ذات گرامی کی سوانح کا مفصل تذکرہ ہے جس کے طفیل میں مغربی تہذیب کے نسل و رنگ کے مساوات کے کھوکھلے نعروں کے مقابلہ میں لوگوں کو اسلام کی بخشی ہوئی حقیقی اخوت و مساوات اور عدل و انصاف کا روشن جلوہ نظر آتا ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جن صفات کا مختصر حال اس کتاب میں درج کیا گیا ہے وہ وہی صفات ہیں جو سیاہ جنس کی پوری نسل میں پائی جاتی ہیں، ہمیں یہ کہنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ جو شخص ان صفات سے متصف ہوگا وہ لازماً اپنی خصوصیات کی بنا پر سیاہ جنس کا فرد ہوگا البتہ جو بات بالعموم کہی جاتی ہے اور وہ صحیح بھی ہے۔ کہ اگر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان صفات کے حامل نہ ہوتے تو یہ بات عجیب و غریب اتفاقات میں شمار ہوتی غرضیکہ اگر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جلد سیاہ نہ ہوتی تو ان کی نفسی صفات میں ایسی علامات پائی جاتیں جو سیاہ جنس کے لوگوں میں عجوبہ نہیں سمجھی جاتی ہیں اس لئے کہ وہ ان ممتاز خصائص میں سے ہیں جو اجمالی نظر ڈالنے سے بھی ان میں نظر آجاتی ہیں، ان خصائص میں موسیقی کے ساتھ ان کا شغف ایمان، قربانی، ضد و عناد اور جسمانی تکالیف اور اذیتوں پر صبر اور غم خوار دوست اور ہمدرد شخص کے ساتھ وفاداری۔ لیکن سیاہ جنس والوں میں بھی وہ صفات بالعموم پائی جاتی ہیں جو ان کے جسمانی وجود میں نہیں پائی جاتی تھیں مثلاً ان کے ہونٹ موٹے اور بھدے نہیں تھے او بجز سیاہ رنگ کے ان کے بال اُون کی طرح کے اور سکڑے ہوئے نہیں تھے جو زنجیوں کی ممتاز خصوصیت ہے زنجیوں کے متعلق تاریخی تحقیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ان کا امتزاج سامی یا عربی اجناس کے ساتھ خصوصیت سے ہے اس لئے کہ عربوں کی آمدورفت سواحل افریقہ شرقیہ کی طرف قبل از اسلام عرصہ دراز سے قائم ہے، اور علماء اجناس میں سے وہ لوگ ہیں جو حبشیوں اور عربوں خاص کر یمنیوں کے ساتھ مضبوط روابط و تعلقات کی نشاندہی کرتے ہیں اس لئے کہ اہل یمن کا حبشہ کی طرف کوچ اور اہل حبشہ کا یمن کی طرف کوچ قدیم ترین زمانہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بابت تاریخ میں مذکور ہے کہ وہ مولدین مکہ کے موالی میں سے تھے ان میں سب سے صحیح بات یہ ہے کہ وہ سامی زنجی نسل سے تھے اور ان میں عربوں یا مستعمرین کی خصائل و عادات پائی جاتی تھیں۔

عرب اور اجناس

گذشتہ باب میں ہمیں مسئلہ عنصر و نسل اور اجناس کے فرق و امتیازت کے بارے میں بعض علماء کے قول سے بڑا دکھ پہنچا ہے عصبیت کے بارہ میں خواہ نسلی و عنصری ہو یا جنسی دو قول زیادہ مشہور ہیں اور بعض اوقات ان میں بھی ایسا التباس اور مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے بہر حال مفاخرت کبھی جنسی ہوتی ہے جس میں عداوت کا عنصر شامل نہیں ہوتا اور کبھی عداوت جنسی ہوتی ہے اور اس میں مفاخرت نہیں پائی جاتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مفاخرت قدیم زمانہ سے جماعتوں اور گروہوں کی طبعیت اور جبلت کا خاصہ رہی ہے بعض اوقات مفاخرت ایک ہی قوم یا امت میں ان کے متمدن شہریوں اور سادہ لوح دیہاتیوں کے درمیان بھی پائی جاتی ہے یا شمال اور جنوب کے فرزندوں کے درمیان پائی جاتی ہے اور کبھی بڑے قبیلہ کی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بھی جذبہ تفاخر موجود ہوتا ہے مگر ان میں دشمنی نہیں ہوتی۔ اور کبھی دشمنی ہوتی ہے تو تفاخر کا وجود نہیں ہوتا اور کبھی تفاخر پایا جاتا ہے تو ساتھ ہی دشمنی بھی ہوتی ہے حالانکہ یہ سب شاخیں ایک ہی جنس کی ہوتی ہیں اور ایک ہی اصل اور قبیلہ سے تعلق رکھتی ہیں ہمارے خیال میں مصر میں قاہرہ اور اسکندری کے باشندوں کے درمیان بڑی مفاخرت پائی جاتی ہے اس طرح فرزندان صعید و ریف کے مابین بھی جذبہ تفاخر موجود ہے اس کے علاوہ ان میں کئی دوسرے قسم کے تفاخر بھی پائے جاتے ہیں مثلاً لب و لہجہ اور ذوق و وجدان کا تفاخر، مطعومات و ملبوسات کا تفاخر و غیرہ مگر اس نوع کا فخر و تفاخر خوش طبعی اور ہنسی مذاق کی حد سے بالعموم آگے نہیں بڑھتا۔ اسی قسم کا جذبہ تفاخر انگریزی، فرانسیسی، اٹلی اور جرمنی کے ملک کے باشندوں میں بھی اکثر و بیشتر پایا جاتا ہے خواہ وہ ایک ہی اصل و نسل سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں۔ قبا © عناصر ہزاروں

سال سے اگرچہ ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے چلے آرہے ہیں لیکن عنصری و نسلی مفاخرت عنصری و نسلی جوش و جذبہ تک بڑھ جاتی ہے اور جب ان میں کبھی مال غنیمت وغیرہ کے جھگڑے کی نوبت آجاتی ہے تو تاوقتیکہ وہ ایک دوسرے کو ختم نہ کرلیں یا اس کو ذلیل نہ کرڈالیں۔ جھگڑے کے ختم ہونے کی نوبت نہیں آتی اور ان میں یہ عداوت اس وقت مدتوں چلتی ہے جب اس میں خون کے انتقام کا جذبہ اور غارت گری بھی داخل ہو جائے جبکہ مال غنیمت سے زیادہ ان لوگوں میں انتقام اور خون کے بدلہ کا بھوت بھی سوار ہوتا ہے۔

عربوں نے اپنے جزیروں میں اپنے پڑوسیوں کے غلبہ کے خوف و خطر سے بے خوف ہو کر زندگی گزاری ہے البتہ جزیرہ کے اطراف و جوانب سے ان کو ہمیشہ خطرہ لگا رہا عربوں کو اپنے پڑوسیوں سے نزاع کی کبھی ایسی صورت حال پیش نہیں آئی جو ان کو ہلاکت سے دوچار کر دیتی وہ ہمیشہ اس طرح زندگی بسر کرتے تھے کہ اپنے پڑوسیوں کے مرتبہ اور درجہ کا بھی خیال رکھتے تھے اور پڑوسی بھی ان کے مقام و مرتبہ کا احساس رکھتے تھے اس لئے ان م فخر و مباہات کا جذبہ تو برابر قائم رہا لیکن اس جذبہ نے کبھی شدید عداوت و مخاصمت کی صوررت اختیار نہیں کی، عربوں کی تاریخ فخر و مباہات کے جذبات سے بھری ہوئی ہے ان میں یہ جذبہ اس شدت سے پایا جاتا تھا کہ اگر وہ اس سے گلو خلاصی بھی حاصل کرنا چاہتے تو حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پڑوس میں اہل فارس اہل روم اور مختلف قبائل آباد تھے جو صاحب ثروت اور مال و متاع کے مالک تھے، یہ عربوں کو ان کی غربت و تنگدستی کے طعنے دیا کرتے تھے اور انکے لباس و خوراک کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور عرب بھی ان مملکتوں کی دولت و حشمت کی فراوانی اور اشیائے خورد و نوش کے ذخیروں کے بہتات سے ناواقف نہ تھے چنانچہ جب ان کو ان قوموں کے مقابلہ میں فخر و مباہات کا موقع ملتا تھا تو ان کے مطعومات و ملبوسات اور حطام دنیوی کو نظر انداز کر کے اپنی فصاحت و بلاغت، حسب و نسب اور اپنی سماحت و کرامت پر فخر کرتے تھے اور اپنے مقابلہ میں ان سب کو عجمی یعنی گونگا اور بے زبان سمجھتے تھے۔

مذکورہ بالا قومیں عربوں کے نزدیک مخلوط یعنی ملی جلی قوموں اور نسلوں کا ملغوبہ تھیں اس لئے حسب و نسب کی اصلیت کے نقطہ نظر سے وہ ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بہرحال عرب اپنی جن چیزوں پر فخر کرتے تھے انہی کو اپنی زندگی کا اصل سرمایہ سمجھے ہوئے

تھے۔ اور انہی کے متعلق لن ترانیوں میں ہمیشہ مشغول رہتے تھے ان میں آپس میں ان مفاخر کی بنا پر ایسی کوئی قابل ذکر لڑائی نہیں ہوتی جس میں وہ خود ہلاک ہوئے ہوں یا انہوں نے دوسروں کو ہلاک کر دیا ہو، عربوں کے فخر و مباہات کے بہت سے لطیفے منقول ہیں اور ان کے ایسے ادبی معرکے بھی مشہور ہیں جن میں ہنسی ہنسی اور مذاق میں خون خرابہ تک نوبت پہنچ گئی جب روم اور فارس کے لوگوں نے اپنے گورے رنگ پر فخر کرنا شروع کیا تو عربوں نے ان کو چھلا ہوا چہرہ قرار دیا اور جب رومیوں اور اہل فارس نے اپنے دستر خوانوں کے حوالے سے بات کی تو اس کے جواب میں عربوں نے اپنی جود وسخا اور سب کچھ لٹا دینے پر فخر و ناز کا اظہار کیا۔ غرضیکہ اس میدان میں کبھی وہ دوسروں سے سبقت لے جاتے اور کبھی دوسرے ان سے بازی لے جاتے، بہرحال عربوں نے اس بات کا لوہا ضرور ان سے منوا لیا کہ وہ صاحب فصاحت و بلاغت ہیں اور حسب و نسب کے بے تاج بادشاہ ہیں لیکن عربوں میں کبھی ایسی نسلی یا جنسی رقابت نہیں پائی گئی جیسی امریکہ کے گوروں اور ریڈ انڈین میں یا یورپ کے باشندوں اور براعظم آسٹریلیا کے باشندوں میں یا جیسی کسی زمانہ میں سلانیوں اور تیوتونوں کے درمیان مشرقی یورپ میں یا اسرائیلیوں اور کنعانیوں میں یا شمالی افریقہ کے ممالک اور اسپین کے باشندوں کے درمیان پائی جاتی تھی۔ جب میں کسی عربی کی زبان سے غلاموں کی برائی سنتا ہوں تو جو خیال سب سے پہلے میرے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ عربوں کے ذہن میں جنس و رنگ کا جذبہ پھر عود کر آیا ہے یا انہوں نے سیاہ رنگ کو حقارت و دشمنی کے ساتھ مختص کر دیا ہے، بہرحال بعض عرب بھی اپنے سیاہ رنگ کے باعث بہت مشہور گزرے ہیں ان کا ایک سردار تو رنگ کا اس قدر کالا تھا کہ زنجی بھی اس کو سخت سیاہ کھردری پکی کھال اور کوئلہ سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ عرب جب کسی کو عبد یعنی غلام کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد زنجی نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ سیاہ رنگ کو حقارت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں بلکہ ان کا مقصد عبد کے لفظ سے ایک ایسا اسیر اور قیدی ہوتا ہے جو کبھی قید سے رہائی نہیں پاتا یا باہر سے لایا ہوا ایسا غلام ہے جو بازار میں بیچا اور خریدا جاتا ہے یا کم از کم لفظ عبد سے ان کی مراد ایک ایسے انسان سے ہے جو مجہول النسب ہے اور جو مشہور اصول میں سے کسی خاص اصل یا نسل کی طرف منسوب نہیں۔ تاہم ان کے نزدیک غلام اپنے رنگ کی سیاہی کے باعث ذلیل و حقیر نہیں ہوتا اور نہ اس لئے حقیر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق کسی دشمن جنس سے ہے بلکہ وہ محض

اجتماعی اور معاشرتی حیثیت کی وجہ سے حقیر و ذلیل سمجھا جاتا ہے اور یہ وجہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک نسلی و عنصری وجوہات اور جنسی عداوتیں دور نہیں ہوں گی۔ عربی دولت و ریاست کی وسعت اور حصول غلبہ کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا جب سیاہ فام زنجی کھنچ کھنچ کر براعظم افریقہ کے دریاؤں سے متصل ان علاقوں میں پہنچ گئے تھے جو عربی دارالحکومتوں کے قرب و جوار میں تھے۔ اس زمانہ میں ایسا سب سے بڑا علاقہ بصرہ تھا چنانچہ زنجیوں اور عربوں نے اس صورت حال کے پیش نظر قدیم و جدید زمانہ جیسی عداوت و دشمنی کی لہر عود کر آئی اور بصرہ میں وہ مشہور زنجی فتنہ برپا ہوا جس کی مثل زمانہ ماضی میں یا موجودہ زمانہ کے جنسی فتنہ میں نظر آتی ہے یا جس کی نظیر ہمیں گذشتہ زمانہ کی تاریخ میں ملتی ہے۔ زنجی فتنہ کی یہ لہر بڑے زور شور سے اٹھی تھی لیکن اسی طرح وہ اتر بھی گئی اور چند سال بعد اسکا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ اس پچھلے زمانہ کو چھوڑ کر جزیرہ کی دیہی اور شہری آبادی میں زنجیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ کبھی کبھار کوئی عرب کسی زنجی یا حبشی کنیزہ سے بچے پیدا کراتا اور اس کے غلام لڑکے کو اپنا بیٹا بنالیتا تھا بشرطیکہ وہ اس میں نجابت کے جوہر دیکھتا اس کے چال چلن کو بہتر سمجھتا اور اس میں شہسواری اور بہادری کے آثار دیکھتا نیز اس میں اسے فصاحت و بلاغت اور ادبی ذوق کے جوہر نظر آتے۔ اور بسا اوقات یہ غلام اگر سیرت و کردار کے لحاظ سے قابل تعریف ہوتا تو نہ صرف اس کو آزاد کر دیتا تھا بلکہ اس کو اپنے خاندان میں شامل بھی کر لیتا تھا اور اپنی بیٹی سے یا اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے اس کی شادی کر دیتا تھا اور ایسا کرتے وقت عرب کے لئے نہ جنسی عداوت رکاوٹ بنتی تھی اور نہ سیاہ رنگ کا عیب مانع آتا تھا صرف اجتماعی زندگی کے رسم و رواج شادی بیاہ کے معاملات میں حتّٰی کہ اپنے قریبی عزیز و اقارب میں بھی عام طور پر رکاوٹ بنتے ہیں چنانچہ یہی سماجی رسم و رواج اور معاشی و معاشرتی امتیازات اکثر و بیشتر عرب اور زنجیوں کے مابین مخلوط معاشرہ کے قیام میں بڑی رکاوٹ بنتے تھے اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم ہر سیاہ فام غلام کی اس نسبت کو محفوظ رکھیں جس کا تذکرہ عربوں کی جنگ میں زنجیوں اور حبشیوں کے حوالہ سے ملتا ہے یا فرزندان حام سے اس کا تعلق علم الاجناس کے معروف طریقہ سے جاملتا ہے شاید اس لئے ایتھوپیوں کی طرف سامی نسل افریقہ کی طرف کوچ کر گئی اور سامیوں اور حامیوں میں سے خلاسی یعنی سفید و سیاہ رنگ کی ایک مخلوط نسل تیار ہو گئی اور گمان غالب تو یہ ہے کہ اس کتاب کے صاحب سیرت حضرت

بلال رضی اللہ عنہ، حامی حبشی تھے اور خالص سیاہ فام زنجی نہ تھے کیونکہ عرب اجناس اور نسلوں کے خدو خال کی بڑی زبردست پہچان رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ تعالی عنہ کے اوصاف میں چپٹی ناک اور ادنٰی قسم کی گھنگریالے بالوں کا کہیں ذکر نہیں کیا ا ہے اور یہ دونوں خصوصیتیں حامی النسل لوگوں میں بالکل نہیں پائی جاتی ہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی معاشی حالت قبل اسلام نہایت خستہ تھی ایام جاہلیت میں عام طور پر عربوں کے پورے معاشرہ میں غلاموں کی حالت بہت خراب تھی اور اس کی وجہ ان کا جرم ضعیفی تھا چنانچہ ان کو اس جرم ضعیفی کی سزا عربوں کے جاہل طبقہ کی طرف سے ظلم کی صورت میں برداشت کرنا پڑتی تھی اس ظلم میں بجز ان کی مالی حالت ابتری و کمزوری کے جنسی نفرت و عداوت کا بظاہر کوئی دخل نہ تھا چنانچہ ان کی نظر میں ہر غلام کا حال اس غریب و نادار اور محتاج کا تھا جو نسبی اعتبار سے ذلیل و حقیر و بے سہارا اور دیت و خون کے بدلہ کے لئے ناکارہ و نااہل سمجھا جاتا ہے اور جو ظالم کے ظلم کو شرع، عرف اور عقیدہ کسی بھی اعتبار سے دفع کرنے کے قابل نہیں ہوتا چنانچہ وہ غریب ہمیشہ ظلم و تعدی کا شکار اور سماج کی نفرت و حقارت کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ اس لئے ان کی گلو خلاصی اور نجات صرف اس عقیدہ کی حلقہ بگوشی سے ہی ہو سکتی تھی جو ظلم و ستم کو روکتا معاشی عدل و انصاف اور سماجی اخوت و مساوات قائم کرتا ہے۔ دراصل اسلام ہی دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جو ظلم کی بیخ کنی کرتا اور ظالم کا ہاتھ پکڑتا ہے اس لئے مظلوم غلام کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ایسی دعوت حق پر خود بھی لبیک کہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دے۔

اسلام اور غلامی

عقیدہ روحانیت در حقیقت انسانی عزت و وقار اور موجودہ جمہوری طرز حکومت کی جانب پہلا قدم ہے چونکہ عقیدہ روحانیت ہی نے انسان کو دوسروں کی اتباع اور پیروی کا سبق دیا ہے، اور اس اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اس لئے یہی عقیدہ انسان کے ذمہ دار اور جواب دہ مخلوق ہونے کی بنیاد ہے اور اسی نے بنی نوع انسان کو خدا اور اسکی شریعت کی نظر میں یکساں اور مساوی قرار دیا ہے۔ دور غلامی عقیدہ روحانیت سے قدیم تر ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر دور غلامی عقیدہ روحانیت سے قدیم تر نہ ہوتا تو ادیان سابقہ اپنی کتابوں میں اس کا اعتراف نہ کرتے کیونکہ ایک بے جان جنس کی طرح انسان کی خرید و فروخت ایک ایسے روحانی عقیدہ سے کس طرح میل کھا سکتی ہے جس میں آقا اور غلام کی روح کو مساوی حیثیت حاصل ہے بلکہ صالح غلام کی روح کو غیر صالح آقا کی روح پر فوقیت و فضیلت دی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ ادیان و مذاہب سے ہزارہا سال قبل سے انسانی سوسائٹی میں غلامی کا رواج چلا آرہا تھا اور چونکہ زمانہ قدیم میں ہی غلامی سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کا جز بن چکی تھی اس لئے انسانی معاشرہ سے اس کا یکلخت خاتمہ نہایت دشوار ترین امر تھا مزید براں یہ کہ لوگوں کے اخلاق و خصائل بھی اتنے بلند اور ارفع نہ تھے اور نہ ہی ان کے جذبات و احساسات اتنے شائستہ اور پاکیزہ تھے کہ جانوروں اور اشیائے ضرورت کی طرح وہ انسانوں کی خرید و فروخت سے گریز و اجتناب کرتے اور غلامی کے سلسلہ خرید و فروخت کو یکلخت ختم کر دیتے پچھلے آسمانی و روحانی مذاہب نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی اگرچہ پوری کوشش کی لیکن اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

علاوہ ازیں بیشتر غلام بھی زمانہ کے اس مسلط کردہ ظالمانہ نظام کے عادی اور اس سے

مانوس ہو گئے تھے اور جو اس سے نفرت بھی کرتے تھے ان میں اس غیر انسانی اور قبیح نظام سے نفرت کرنے کی ہمت و جرات نہ تھی بایں ہمہ مذہبی مصلحین بھی اس کی ایسی کوئی توجیہہ نہ پیش کر سکے جس سے انسانی خرید و فروخت اور عقیدہ روحانیت میں توافق پیدا کیا جا سکتا۔

ان مصلحین کی طرف سے صرف ایک ہی وجہ بالعموم پیش کی جاتی تھی اور وہ یہ کہ غلام جسمانی طور پر اگرچہ غلام ہے لیکن اس کی روح آزاد ہے اور گو وہ دنیا میں غلام ہے لیکن آخرت میں سردار ہو گا اور صالح و متقی لوگوں کے رتبہ پر فائز ہو گا۔

چنانچہ مقدس پولوس نے اہل رفس کو جو خط لکھا ہے اس میں اس نے غلاموں کو بطور خاص تاکید کی ہے کہ وہ خلوص دل سے اپنے آقاؤں کی اسی طرح اطاعت کریں جس طرح وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد پطرس نے بھی غلاموں کو اسی بات کی تلقین کی اور ان کے لئے اپنے آقاؤں سے ڈرنا اور خوف کھانا اتنا ضروری قرار دیا گیا کہ گویا یہ حکم اور طریقہ بھی دین مسیح کے مجملہ دیگر احکام کے ایک ضروری حکم ہے۔ اس کے بعد جب واقعتاً کلیسائی دور آیا تو اس نے بھی اس نظام کو قائم و برقرار رکھا اور روم کے علماء نے اپنے گشتی مراسلوں اور دینی مواعظ میں بھی اس کا خصوصیت سے ذکر کیا تیرھویں صدی عیسوی کے مشہور صوفی فلسفی اور ارسطو کے شاگرد توما اکوینی نے بھی غلامی کے اس نظام کی تائید کی چنانچہ انہوں نے اپنی سیاست سے متعلق ایک کتاب میں مسیحی قاصدوں اور ارسطو کے اقوال بھی بطور حوالہ پیش کیے ہیں ارسطو کے خیال کے مطابق غلام کوئی معیوب بات نہیں اس کے نزدیک غلاموں کی حیثیت ایسے ضروری آلات و اوزار کی سی ہے جو کسی کام کے لئے استعمال کیئے جاتے ہیں نیز اس کا خیال ہے کہ جب کوئی شخص خود اپنی کفالت کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کی سرپرستی اور ماتحتی میں زندگی بسر کرے۔ ارسطو کے شاگرد اور صوفی فلسفی توما اکوینی بھی اس سلسلہ میں اس کے ہم خیال ہیں کیونکہ اس کے نزدیک زہد و تقویٰ انسان کو قناعت کے ایسے پست ترین مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں ان امور کو برا اور معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ حد سے بڑھی ہوئی قناعت تو تارک الدنیا لوگوں کی ایک گونہ مروجہ خوبی اور پسندیدہ صنعت سمجھی جاتی ہے جب کسی تارک الدنیا شخص کو اس مخصوص قسم کے مزاج اور افتاد طبع کے ساتھ ساتھ غلامی سے بھی واسطہ پڑے گا تو اس میں زہد و پارسائی اور اتقاء و

محرومی کی ایسی صفت اور کیفیت پیدا ہو جائے گی جو تصوف کی بلند ترین خوبیوں میں سے ایک ہے نیز اسے ضروریات زمانہ ان کے تقاضوں اور اسرار کائنات کی ان خصوصیات کا بھی بآسانی اندازہ ہو جائے گا جس پر عملدر آمد کسی نہ کسی شکل میں دوسرے عمل سے منسلک اور وابستہ ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جن ملکوں میں کسی بھی جاندار کو مارنا حرام اور نہایت گناہ کا کام سمجھا جاتا ہے وہاں بھی غلاموں کے ساتھ بدسلوکی و بے دردی اپنے عروج کو پہنچی ہوتی تھی چنانچہ ہندوستان کے برہمن شودروں کے ساتھ غلام کی طرح نہایت حقارت سے پیش آتے تھے اور ان کو حد درجہ ظلم و ستم کا نشانہ بناتے تھے، یہ شودر ان کے عقیدہ کے مطابق چونکہ دیوتا کے جسم کے زیریں حصے سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے وہ زندگی بھر کے لئے ذلت و حقارت کے مستحق ہیں۔ ان کا آقا عتاب کی صورت میں ان کو ادنیٰ سزا یہ دیتا تھا کہ معمولی سے قصور پر بھی غلام کی زبان کھینچ لیتا تھا یا اس کے اعضا کاٹ کر اس کو سرعام قتل کر دیتا تھا لیکن جیسے جیسے تہذیب و تمدن کی ترقی ہوئی غلاموں کے ساتھ سلوک میں بھی فرق پڑنا شروع ہو گیا۔ چنانچہ بعض قومیں غلاموں اور باندیوں کے ساتھ شفقت اور حسن سلوک سے پیش آنے لگیں اور ان کے ساتھ بعض حقوق میں مساویانہ سلوک کیا جانے لگا چنانچہ قدیم مصری باشندے اپنی کنیزوں کے ساتھ منکوحہ بیویوں جیسا سلوک کرنے لگے اور اگر کوئی شخص کسی غلام کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دیتا تھا تو اس کی پاداش میں خود اس شخص کو بھی قتل کر دیا جاتا تھا حتیٰ کہ سزائے موت کے مجرموں کو بھی غلاموں کی تعذیب اور ایذا رسانی سے اپنی برات کا ثبوت مہیا کرنا پڑتا تھا جس سے ان کو کسی حال میں بھی چھٹکارہ نہیں ملتا تھا۔ چنانچہ مصریوں سے ہی عبرانیوں نے غلاموں پر سختی کرنے اور نفاذ احکام میں ظلم و ستم روا رکھنے کو نہایت معیوب اور حرام سمجھنا شروع کیا اور چونکہ یہی لوگ مصر میں بالعموم احکام کے نفاذ و اجراء کا کام سرانجام دیتے تھے اس لئے ان میں غلاموں کی خونریزی رکوانے اور ان کے ساتھ انصاف سے پیش آنے کا رجحان پیدا ہوا غرض کہ یہ لوگ غلاموں پر ظلم و ستم کو جتنا برا سمجھتے تھے اتنا ہی احکام کے اجراء و نفاذ میں مار پیٹ اور ان کی ایذارسانی کو سخت معیوب سمجھتے تھے، مسٹر ہیرودت کا کہنا ہے کہ اہل فارس کے یہاں غلاموں کو پہلے جرم پر سزا دینے کی ممانعت تھی لیکن دوسری بار ارتکاب جرم پر وہ غلام کو قتل کر ڈالتے تھے یا اس کو کوئی سخت

ترین سزا دیتے تھے اور اس میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے بہر حال ایرانیوں کا قانون غلاموں کے حق میں یونان و روما کے قوانین کے مقابلہ میں زیادہ نرم اور لچک دار تھا کیونکہ ان کے قانون میں غلام کو قدرے رعایت دینے کی گنجائش تھی اور وہ حتی الامکان غلاموں پر ظلم و ستم کو ناپسندیدہ فعل سمجھتے تھے غلاموں کے ساتھ ان کی رعایت و شرافت کی وجہ غالباً ان کا کنیزوں کو بیویاں بنا لینا تھی بہر حال بڑے بڑے شہروں کے تمدنی پھیلاؤ، تہذیبی تقاضوں اور معاشی ضرورتوں نے بھی غلاموں کے ساتھ نرمی اور رواداری کا سلوک برتنے کا سب کو احساس دلایا تھا، جس کے باعث کسی قوم نے بھی غلام کے مظالم کو برقرار رکھنے اور غلاموں کو قومی اور نسلی اختلاف کے باوجود ذلیل بنا کر رکھنے کو پسندیدہ نہیں سمجھا۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ غلامی کے مسئلہ میں شمالی یورپ کی اقوام کو جنوبی یورپ کی اقوام پر ایک گونہ شرف و فضیلت حاصل ہے بالکل غلط اور ایک ایسا مغالطہ ہے جو اسباب کے حقائق دریافت کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ اس لئے کہ شمالی یورپ کی اقوام غلامی کے مروجہ نظام سے اپنے نام نہاد اعلیٰ فضائل اخلاقی کی بدولت علیحدہ اور دور نہیں رہیں بلکہ اس کی اصل وجہ صرف ان علاقوں کی سرد اور خنک آب و ہوا رہی ہے اس لئے یہاں اگر غلامی کا رواج نہیں رہا تو اس میں یہاں کے باشندوں کے اخلاقی فضائل کا کوئی دخل نہیں بلکہ جو کچھ بھی ہے یہاں کی سخت ترین موسمی کیفیت اور ضرورتوں کا تقاضا ہے حقیقت یہ ہے کہ غلاموں کا طبقہ ہمیشہ خالص انسانی مساوات اور مکمل عدل و انصاف سے محروم رہا ہے اور آج تک ان غریبوں کا یہی حال ہے یورپ کی کالونیوں اور نو آبادیات میں تو اٹھارہویں صدی عیسوی تک غلاموں کو قید سے بھاگنے یا اپنے آقا سے سخت کلامی کرنے کی صورت میں قتل کر دینے کا عام قانونی حق آقاؤں اور مالکوں کو حاصل تھا۔ الغرض غلاموں کی یہ حالت زار صرف قرونِ اولیٰ ہی کی یادگار نہیں ہے بلکہ قرون جدیدہ میں بھی اس مظلوم طبقہ کے ساتھ سب جگہ کم و بیش یہی حالت رہی حتیٰ کہ ان کی یہ حالت آسمانی مذاہب کے ظہور سے قبل و بعد بھی تقریباً ایسی ہی رہی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی من جملہ ان اسباب کے جو غلاموں کے حالات کے بہتر ہونے اور دور جدید میں ان کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ بعض ایسے ممالک کو جنہیں غلاموں کے حصول کی سہولتیں حاصل تھیں ان ملکوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو اپنے کارخانوں اور فیکٹریوں کے لئے لیبر بھرتی کرتی تھی اور وہ ان کو اتنی

اجرت دیا کرتے تھے جس کا تصور بھی اس زمانہ کا کوئی حبشی غلام نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال جب غلاموں کو نسبتاً زیادہ مراعات ملنے لگیں تو اس کا مضر اثر اس آزاد لیبر اور کارکنوں پر بھی پڑا جو اپنے لئے بہتر معاوضہ اور زیادہ اجرتوں کے لئے تگ و دو کر رہے تھے اور جس کی تائید ان کو ایسے مال دار حلقوں سے حاصل ہو رہی تھی جو غلاموں سے استفادہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

جب ہم غلامی تاریخ اور غلاموں کے ساتھ عہد بہ عہد کے ناروا سلوک اور ناگفتہ بہ حالات کا اسلامی دور کے عادلانہ حالات و کوائف سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر غلامی کے رواج کو مٹانے کے لئے اور رفتہ رفتہ معاشرہ سے غلامی کے متعلق قدیمی اثرات کو دور کرنے کے بارہ میں اسلام کی کوششیں صاف طور پر نظر آتی ہیں اسلامی احکام کی رو سے مسلمانوں کے لئے کبھی غلاموں کا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ مسلمانوں کے زمانہ میں اکثر و بیشتر غلاموں کو ملک کی اقتصادی اور معاشی امور کی دیکھ بھال اور نگرانی کے فرائض سپرد کئے جاتے تھے ان کا اصل کام معیشت کو ترقی دینا اور کاروباری امور کو چلانا تھا تاکہ دوسرے لوگ پوری دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ جہاد اور اعلاء کلمتہ الحق کے لئے اپنی زندگیاں وقف رکھیں یا حکومتی کاموں کو سرانجام دیں۔

اسلام نے جس طرح غلام بنانے کی رسم کی بیخ کنی کی اسی طرح اس نے جنگی قیدیوں کے ساتھ بھی ناروا غلامانہ سلوک سے لوگوں کو باز رکھا اور ان کی بلا معاوضہ آزادی کو اجر عظیم قرار دیا اور بہت سے گناہوں میں کفارہ کے طور پر بھی غلام آزاد کرنے کو بھی دیگر طریقوں کے ساتھ شامل رکھا حتیٰ کہ جہاں جہاں غلاموں کو اپنی حکومتیں قائم کرنے کا موقع ملا۔ عام مسلمانوں نے ان کو بڑی خندہ پیشانی اور خوشدلی سے اپنا حکمران تسلیم کیا اور کسی بڑے سے بڑے آزاد مسلمان کے مقابلہ میں کبھی کسی مسلمان غلام حاکم کو کمتر نہیں سمجھا بلکہ سب لوگ ان کو اپنا آقا اور سردار سمجھتے اور ہر ہمیشہ نہایت عزت کرتے تھے تاہم تمام ادیان عالم میں یہ شرف صرف اسلام ہی کو حاصل رہا ہے کہ اس نے غلاموں کو ذلت کی زندگی سے نکال کر عزت و احترام کے تخت پر بٹھا دیا اور اگر وہ ایسا نہ بھی کرتا اور غلامی کو برقرار رکھتا تو بھی پوری دنیا میں اس کے لئے اس سے بازپرس کرنے والا کوئی نہ تھا حتیٰ کہ دعوت اسلامی کی تحریک کو بھی غلاموں کے ساتھ سرد مہری برتنے میں کسی قسم کے نقصان پہنچنے کا بھی کوئی

اندیشہ نہ تھا۔ اس لئے کہ مسلمان اس خسارہ کو بھی اچھی طرح برداشت کر سکتے تھے جو کہ ان کو غلاموں اور کنیزوں کو آزادی دلانے کے باعث برداشت کرنا پڑتا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے باپ ابو قحافہ اپنے بیٹے کو زر کثیر خرچ کر کے غلاموں کو آزاد کرنے کے سخت خلاف تھے اور ان کو اس غیر مفید کام سے اس لئے روکتے تھے کہ وہ اپنے خیال میں یہ سمجھتے تھے کہ ان غلاموں سے مدد تو کیا ملے گی یہ تو الٹا ہمارے لئے بوجھ بن جائیں گے اس سے معلوم ہوا کہ اسلام نے غلامی کے رواج کو مٹانے کے لئے ان کو آزاد کرنے کا جو طریقہ اور سلسلہ شروع کیا اس کا سبب صرف اسلام کی اعلیٰ تعلیم اور اخلاقی قدریں تھیں جن میں دنیاوی اغراض اور مادی منفعتوں کا قطعاً کوئی دخل نہیں تھا غرضیکہ اس طرح غلامی کا نظام و رواج اسلام کے ہاتھوں بالکل باطل اور معدوم ہو گیا اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں غلامی کے رواج سے مطابقت رکھنے والی کوئی چیز موجود نہیں ہے، اسلام میں بڑائی اور عظمت کا معیار نہ غلامی اور آزادی ہے اور نہ دیگر اقوام کی طرح نسل و رنگ اور جنس کی فوقیت ہے بلکہ اسلام میں بڑائی کا اصل معیار تقویٰ اور نیکی ہے جو شخص جتنا متقی اور پاک باز ہے وہ اسلام کی نظر میں اتنا ہی محبوب اور پسندیدہ ہے، قرآن پاک نے مسلمان کو مسلمان کا بھائی قرار دیا ہے اور اس طرح اس نے جغرافیائی قومیت اور نسلی امتیاز کی جڑ ہمیشہ کے لئے کاٹ کر رکھ دی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔

"جنت اس کو ملے گی جو میری اطاعت کرے گا اگرچہ وہ حبشی غلام ہو اور دوزخ میں وہ شخص جائے گا جو میرا نافرمان ہو گا خواہ وہ کیسا ہی شریف قریشی ہو"

اسلام نے غلام کو صرف ایک صورت تک محدود رکھا ہے اور فقط ایک شکل میں اس کو منظور و قبول کیا ہے اور وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں میدان جنگ میں اسیر ہو کر اور گرفتار ہو کر قید ہونا، اس کے علاوہ کسی مسلمان کو کسی غلام کو خریدنے یا اچک کر لے جانے اور اپنا غلام بنانے کا کوئی حق نہیں ہے چنانچہ ایسوں کو غلام نہیں کہا جائے گا صرف میدان جنگ میں گرفتار ہو کر آنے والے ہی غلام و کنیز بنائے جا سکتے ہیں اور پھر ان کو بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ خود زر فدیہ ادا کر دیں یا ان کی طرف سے کوئی دوسرا شخص ان کا معاوضہ ادا کر کے ان کو آزادی دلا دے، قرآن پاک کی رو سے ایسے غلام اور کنیزیں بلا کسی معاوضہ اور زر فدیہ کے بطور احسان بھی رہا کیے جا سکتے ہیں۔

دعوت اسلامی کے سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد غلام بنانے کا دستور تو بالکل جاتا رہا کہ اب اس کی ضرورت غالباً باقی نہیں رہی تھی البتہ قید کر لینے اور فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا طریقہ معمول کے مطابق چلتا رہا اس کے علاوہ قیدیوں کے بدلہ قیدیوں کے تبادلہ پر بھی عملدر آمد ہوتا رہا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک طرفین میں **جنگیں** ہوتی رہیں جس کے نتیجہ میں قیدیوں کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا تو مذکورہ بالا طریقہ کے سوا اور کوئی مقبول و معروف طریقہ اس مسئلہ کے حل کا تھا بھی نہیں غرضیکہ اسلام نے غلام کے مسئلہ کی شدت کو کم سے کم کرنے اور اس کے دائرہ کار کو محدود تر کرنے کے سلسلہ میں مذکورہ بالا واحد طریقہ کو مقبول بنانے اور رائج کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی بلکہ اس نے تو مسلمانوں کو واضح حکم دے دیا کہ یا تو فدیہ قبول کر لو اور قیدیوں کو چھوڑ دو یا بغیر فدیہ لئے ہی ان کو بطور احسان آزاد کر دو اور اس کے لئے قرآن پاک میں صاف اور واضح حکم موجود ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

”پھر اس کے بعد یا محض احسان رکھ کر چھوڑ دو یا معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دو تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔“ (سورہ محمد آیت ۴)

اسلام نے مسلمانوں کو یہ حکم بھی دیا ہے کہ وہ اپنے قیدیوں کو خصوصی سہولتیں دیں اور ان سے معاوضہ کی رقم آسان قسطوں میں تھوڑی تھوڑی وصول کر کے ان کو گلو خلاصی کا موقع فراہم کریں، قرآن پاک میں خدا کا حکم ہے۔

”تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتب ہونے کے خواہاں ہوں تو انہیں مکاتب بنا لیا کرو“ (سورہ نور آیت ۳۳)

یہی نہیں بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھا کر اسلام نے غلاموں کی گلو خلاصی اور آزاد کرنے کو بہت سے گناہوں کا کفارہ قرار دیا ہے، حتیٰ کہ بعض احکام دین میں غفلت و کوتاہی برتنے پر بھی غلام آزاد کرنے کو صدقات و طعام مساکین کی طرح ضروری اور واجب ٹھہرایا ہے، اسلام نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور ان کے ساتھ شفقت و مروت کا برتاؤ کرنے کو ماں باپ اور اقرباء کے ساتھ حسن سلوک کے برابر قرار دیا ہے ”اور والدین سے حسن سلوک رکھو اور قرابت داروں یتیموں اور مسکینوں اور پاس والے پڑوسی دور والے پڑوسی ہم مجلس اور راہ گیر کے ساتھ اور جو تمہاری ملک میں ہے۔“

"بیشک اللہ تعالیٰ اترانے والے اور غرور کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔"

(سورہ نساء آیت ۳۶)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی وفات سے قبل جن دو خاص امور کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے ان میں ایک نماز اور دوسرے غلام اور باندیاں ہیں، اسی مفہوم کی متعدد دیگر احادیث بھی آپ ﷺ سے مروی ہیں، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مجھے میرے دوست جبرئیل نے غلاموں کے ساتھ اتنی شفقت ورحمت کی وصیت کی کہ میرے ذہن میں یہ بات جم گئی کہ "نہ لوگوں کو غلام بنایا جائے اور نہ ہی ان سے خدمت لی جائے۔" حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو غلاموں اور باندیوں کے ساتھ کتنی شفقت اور تعلق تھا اس کا اظہار اس حدیث سے ہوتا ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

"تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام یا باندی کو عبدی یا امتی یعنی میرے غلام یا میری کنیز کہہ کر نہ پکارے بلکہ فتای یا فتاتی و یا غلامی یعنی میرے نوجوان یا میرے لڑکے یا میری لڑکی کہہ کر آواز دے۔"

اسلام میں غلام کو تہذیب و شائستگی سکھانے کے علاوہ کسی اور امر کے لئے مارنے پیٹنے کی اجازت نہیں ہے اور اگر تادیب و تہذیب کے مقصد کے علاوہ غلام کو سزا دی جائے گی تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ غلام کو آزاد کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔

"جس شخص نے اپنے غلام کو تھپیڑ مارا تو اس کا کفارہ اس کو آزاد کر دینا ہے"

اور بعض مشہور فقہاء کے قول کے مطابق اگر کوئی شخص اپنے غلام کو قتل کر دے گا تو اس کے قصاص میں اس کو بھی قتل کر دیا جائے گا اسی طرح اسلام نے مسلمان کنیز کے ساتھ نکاح کرنے کو آزاد مشرک عورت کے ساتھ نکاح کرنے پر فضیلت و ترجیح دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے غلام زید کو پہلے آزاد کیا اور پھر ان کا نکاح اپنے معزز خاندان کی نہایت شریف اور محترم خاتون یعنی اپنی پھوپھی زاد بہن سے کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ آپؐ نے اپنے متبنیٰ یعنی زیدؓ کے بیس سال سے بھی کم عمر بیٹے اسامہ کو بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ کے ہوتے ہوئے جن میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے محترم لوگ شامل تھے، شام کی طرف بھیجے جانے والے لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا۔ آنحضرت ﷺ کا طرز عمل اور حسن سلوک نہ صرف اپنے غلاموں کے ساتھ بلکہ دوسروں کے غلاموں کے ساتھ بھی ایسا فیاضانہ اور

مشفقانہ تھا جس کی نظیر اس دور کے کسی ملک میں تو کیا ملتی آج بھی تہذیب و ترقی کے اس دور میں بھی کہیں بھی نظر نہیں آتی آپ ﷺ اپنے یہاں غلاموں کو کھانے پر مدعو فرماتے اور ان کی دعوتیں بڑی خوشی سے قبول فرماتے تھے اور مسلمانوں سے علی الاعلان تاکید فرماتے تھے کہ

"یہ لوگ تمہارے بھائی ہیں اور تمہارے لونڈی غلام ہیں اللہ نے انہیں تمہاری سرپرستی میں دیا ہے جو جس کا بھائی ہے وہ اس کے زیر سایہ ہے وہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے اور ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو اور اگر ڈالتے ہو تو خود بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤ۔"

اس سلسلہ میں آپؐ کے بہترین و پاکیزہ احساسات اور شریفانہ خیالات کا اظہار آپؐ کے مندرجہ ذیل ارشادات سے ہوتا ہے۔

"میں تو اللہ کا بس ایک غلام ہوں اور اسی طرح کھانا پسند کرتا ہوں۔ جس طرح ایک غلام کھاتا ہے اور اسی طرح بیٹھنا پسند کرتا ہوں جس طرح ایک غلام بیٹھتا ہے۔"

غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ یہ عمدہ برتاؤ اعلیٰ اخلاق اور معاملات میں یہ عادلانہ حسن سلوک اسلام کی پاکیزہ تعلیمات، عظیم روایات اور اعلیٰ روحانی اقدار کا نتیجہ تھا جس کے سامنے ان اجتماعی ضرورتوں، دنیاوی فائدوں اور مادی و اقتصادی مصلحتوں کا کبھی کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ جن کو اس دور کی تمام مملکتیں سب سے زیادہ اپنے پیش نظر رکھتی تھیں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرنے یا اس قبیح رسم کی بیخ کنی کرنے کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کے بدیہی اثرات صرف تھوڑی مدت کے لئے ہی ظہور پذیر نہیں ہوئے یا حضرت بلالؓ، یا ان جیسے دوسرے غلاموں اور باندیوں کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان احکامات کی پابندی نہیں کی گئی۔ بلکہ ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں اور مشرکوں میں جتنی جنگیں ہوئیں ان سب میں غلاموں اور باندیوں کے معاملات اسلامی روایات و احکام کے مطابق طے کیے گئے اس لئے یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ اس زمانہ کے غلام اور باندیاں صرف اس لئے مسلمان ہوتی تھیں کہ ان کو ظالم مشرک آقاؤں سے نجات مل جانے کی امید ہوتی تھی، دراصل حسن سلوک مساوایانہ برتاؤ اور معاشرتی و عمرانی انصاف کی یہ عملی مثال صرف حضرت بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، اور عمار بن یاسر کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھی بلکہ یہ تو ادنےٰ نمونہ تھا اس

حسن خلق، اسلامی اخوت اور اس اعلیٰ روحانی تعلق خاطر کا جو ایک کلمہ گو مسلمان کو دوسرے کلمہ گو مسلمان سے ہوتا ہے غرض کہ اسلامی اخوت عدل وانصاف اور پاکیزہ اسلامی اخلاق کا رنگ سب پر غالب تھا یہ بات تو کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے غلام زید بن حارثہ سے اتنا عمدہ اور مثالی سلوک تھا کہ وہ اپنے باپ اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لے آئے اور جب وہ لوگ ان کو لینے کے لئے آئے اور ان کے لیے ہر طرح کا معارضہ دینے پر تیار ہو گئے تو زید بن حارثہ نے اپنے باپ پھوپھی اور قبیلہ والوں کی ایک نہ سنی اور جوار رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لحہ کے لیے بھی جدائی گوارا نہ کی اور اس وطن کی سر زمین میں جانا پسند نہ کیا جہاں سے چند سال قبل ان کو جبراً نکالا تھا، اس مثالی واقعہ کا لوگوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس نے آزاد اور غلام سب لوگوں میں اسلام کو یکساں طور پر مقبول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو ہر دلعزیز اور سب کا محبوب بنادیا اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ غلاموں میں اسلام کی تڑپ جستجو راحت و آرام کے حصول کے لئے نہ تھی ہمیں عقائد دینی کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس میں لوگوں نے کسی دین کو راحت و آرام اور عیش و کامرانی کی خاطر قبول کیا ہو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ تو خاص طور پر ان کے لئے راحت و آسائش کا زمانہ تھا اور نہ ان کے ساتھیوں کے لیے عیش کامرانی کا عہد تھا، یہ زمانہ تو ان نو مسلموں کے لئے خطرات و مصائب سے نکل کر امن و سلامتی کی راہ اختیار کرنے کا بھی نہ تھا بلکہ اس کے برعکس زمانہ سخت ترین مصائب و آلام، ابتلاء و آزمائش اور جان و مال کی قربانی کا تھا، اس زمانہ میں اسلام قبول کرنا زندگی کا چین اور سکون چھوڑ کر ایسی مصیبتوں اور آفتوں کو دعوت دینا تھا جن سے بچانے والا کوئی نہ تھا، اس لیے کہ ظلم و تعدی سے بچانے والے اور مصیبت میں حمایت کرنے اور سینہ سپر ہونے والے صرف قبیلہ و خاندان کے لوگ ہی ہوا کرتے ہیں اور آدمی کی جان و مال کو اسی وقت خطرہ لاحق ہوتا ہے جب وہ خاندان یا اپنے قبیلہ کی ہمدردی و اعانت سے محروم ہوتا ہے لیکن اس غریب و بے کس غلام کی حمایت کے لیے کون اپنا خون بہانا اور جان دینا پسند کرے گا جس کی زندگی کا رشتہ اس کے آقا کی مرضی اور چشم و ابرو کے ایک اشارہ پر موقوف ہوتا ہے غرضیکہ اس زمانہ میں ان مظلوم غلاموں کا حلقہ بگوش اسلام ہونا اس لیے نہ تھا کہ وہ سخت قسم کی غلامی سے نکل کر خفیف تر غلامی میں آنا

چاہتے تھے یا ظالم آقا کے پنجہ استبداد سے نکل کر رحمدل آقا کے سایۂ عاطفت میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ اور اس کی وجہ صاف ظاہر تھی اسلام اپنے آغاز میں اس حالت میں قطعاً نہ تھا کہ ان مظلوم غلاموں میں بھی آزادی کا ایسا احساس اور جذبہ بیدار نہ تھا کہ ظالم آقاؤں کو چھوڑ کر اور ناراض کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل کرنے کی جرأت کرتے۔

بہرحال اس مظلوم طبقہ کا کوئی فرد اگر اسلام لے آتا تھا تو انتہائی ظلم و ستم کے بعد اتفاقیہ طور پر یا حادثاتی طریقہ پر ہی اس کو آزادی نصیب ہوتی تھی، اس لئے یہ خیال بھی سراسر غلط ہے کہ لوگ راحت و آرام کی طلب یا حسن سلوک کی توقع میں اسلام لاتے تھے اس لئے کہ اسلامی احکام کے عمدہ اثرات تو غلاموں اور کنیزوں کے معاملات میں رفتہ رفتہ ہی بعد کو ظاہر ہوئے لیکن بے پناہ مصائب و آلام کا سامنا تو ان کو اسلام لاتے ہی شروع ہو جاتا تھا۔ دراصل کسی عقیدہ یا دین کو قبول کرنے کا اصل فلسفہ یہ ہے کہ ایمان اور دینی عقائد انسانی ضمیر کو ہمیشہ دنیاوی فائدوں اور مادی منفعتوں سے زیادہ اپیل کرتے ہیں اور نفس انسانی کے اضطراب اور اس کے ضمیر کے عدم اطمینان نے ہمیشہ اس کی روح کو بے چین و بے قرار رکھا ہے جس کے لئے اس نے دنیاوی عیش و آرام کو ہمیشہ ہیچ سمجھا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ کوئی معقول انسان ایسے مال غنیمت کو دل سے قبول نہیں کرتا جو صرف اس کے لئے ہی **مخصوص** ہو اور اس کے سوا دوسروں کے لئے عام نہ ہو لیکن جب وہ کسی ایسے عقیدہ پر ایمان لاتا ہے جو اس کی دنیوی زندگی کے ساتھ آخرت کی زندگی کو بھی محیط ہو تو اس کی منفعت اور غرض و غایت کا دائرہ صرف اسی کی ذات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وسیع اور عام ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ایمان لائے تو انہوں نے دیکھا کہ جس دین کو وہ قبول کر رہے ہیں وہ کسی **مخصوص** غلام کو نہیں بلکہ پوری غلامی برادری کے ساتھ عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے اور سب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرتا ہے پھر انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے ایمان لانے سے انسانی شرافت وارتداد حیات کے طریقوں کو تقویت ملی ہے اور اس میں دنیاوی امور کی طرح مسابقت کے جذبہ کا کوئی دخل نہیں ہے بالفاظ دیگر وہ بحیثیت انسان ایمان و ایقان کی دولت سے ٹھیک اسی طرح سرفراز ہوئے ہیں جس طرح اس سے آزاد و شریف اور غلاموں کی خرید و فروخت پر قادر تمام انسان بہرہ ور ہوتے ہیں۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کی جو کم سے کم توجیہات بیان کی جاسکتی

ہیں وہ خود ان کے ضمیر کی پاکیزگی، ان کے نفس کی خوبی و عظمت، ان کی طبعی و فطری استقامت اور حق کو قبول کرنے کا وہ ذوق و شوق ہے جو جسم کے راحت و آرام سے زیادہ نفس کے سکون اور روح کے اطمینان کا متلاشی ہوتا ہے البتہ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ تمام مسلمانوں کے درمیان مکمل اخوت و مساوات کے مظاہر بھی ان غلاموں اور باندیوں کے لئے اسلام کی طرف رغبت اور کشش کا زبردست باعث تھے اور یہ چیز ان کے لئے اس متوقع راحت و سکون سے بھی زیادہ مرغوب و دلآویز تھی جس کی وہ لوگ مستقبل قریب یا بعید میں مسلمان ہونے کے بعد اپنے لئے امید کر سکتے تھے البتہ اسلام نے غلاموں اور باندیوں کے متعلق جو وصیتیں اور تاکیدیں کی ہیں صدیاں گزر جانے کے بعد ان کے نقوش کچھ دھندلا سے گئے تھے، چنانچہ جس کسی نے ان پر عمل کرنا چاہا اس نے عمل کیا اور جس نے ان پر عمل نہ کرنا چاہا اس نے گریز کیا اس طرح بہت سے لوگوں نے حیلہ و مکر سے کام لے کر اکثر اوامر و نواہی میں شریعت کے تقاضوں اور دین کے احکام کو مختلف اسلامی ادوار میں پورا کرنے سے پہلو تہی کی۔ بہر حال اسلامی احکام کے تقاضوں کو اگرچہ پوری طرح پورا نہ بھی کیا گیا ہو پھر بھی ان کا اکتسابی عمل انسانی تاریخ میں بڑا سود مند اور نہایت مفید ثابت ہوا اور بنی نوع انسان کی تاریخ پر اس کے بڑے گہرے اثرات اور مثبت نتائج مرتب ہوئے، چنانچہ لوگوں کو قیدی بنانے کا رواج بڑی حد تک جاتا رہا اور غلام بنانے کا دستور تو یک لخت ختم ہی ہو گیا۔ اور انفرادی اور قومی آزادی کا نعرہ اس زور و شور سے بلند ہوا کہ جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی ابھی اسلام کے سورج کو طلوع ہوئے بارہ سو سال گزرے تھے کہ یورپ میں سیاسی فروغ شروع ہوا اور اس نے بھی غلامی کے رواج کو ناپسندیدہ سمجھا چنانچہ جب اس کی یونان سے جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں آزادی کے طلبگار یونان کے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار قیدی بنا کر مصر لائے گئے تو ان قیدیوں کو انگریز حاکموں نے قاہرہ اور اسکندریہ کے صاحب حیثیت اور خوش حال لوگوں کے خاندانوں میں تقسیم کر دیا لیکن جب صلح و مصالحت ہو گئی تو شرائط صلح کے مطابق طے پایا کہ تمام قیدیوں کو واپس کر دیا جائے اور ان قیدیوں کو جنہیں مصری حکومت نے خرید لیا تھا آزاد کر دیا جائے۔ البتہ ان قیدیوں کا معاملہ التوا میں رکھا گیا جنہوں نے یا خود اپنی قیمت ادا کر دی تھی یا ان کے رشتہ داروں نے ان کا معاوضہ ادا کر دیا تھا لیکن بقول انگریزی نمائندہ کے جو شرائط صلح کے نفاذ کا ذمہ دار تھا تقریباً ساڑھے چار سو قیدیوں کے علاوہ قاہرہ اور

اسکندریہ کے خاندانوں میں تقسیم شدہ بقیہ تمام قیدیوں نے اپنی موجودہ غلامانہ حیثیت میں رہنا دل سے گوارہ کر لیا اور آزادی کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس خود اختیاری حالت پر قناعت کرنے کی جو کچھ بھی تعلیل و توجیہ کی جائے اس امر سے کسی کو انکار نہیں کہ ان یورپین فوجوں نے جنہوں نے ان قیدیوں کو رہا کر کے ان کے مطالبہ آزادی کو تسلیم کر لیا تھا خود غلاموں اور ان مسلمان امراء کے رویہ کو کسی طرح بھی **مستحسن** اور جائز قرار نہیں دیا اور اس طرح غلاموں کی آزادی کے بارہ میں مسلمانوں کے تمام زبانی دعوے ان لوگوں کی نظر میں زبانی جمع خرچ سے زیادہ ثابت نہیں ہوئے۔

حضرت بلالؓ بن رباح

تمام لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حبشی مولدین میں سے تھے (باپ کی طرف سے عرب اور ماں کی طرف سے غیر عرب) آپؓ شکل وصورت اور رنگ وروپ کے اعتبار سے سیاہ فام، نحیف الجثہ، کشیدہ قامت اور قدرے جھکے ہوئے تھے آپؓ کے جسم پر کثرت سے بال تھے مگر داڑھی ہلکی تھی اور یہ مجملہ ان صفات کے تھیں جو ان مولدین کی نسل میں پائی جاتی تھیں جن کا تعلق بالعموم کالوں اور سامیوں سے تھا اور جو قدیم زمانہ سے حبشہ اور یمن کے درمیان آباد تھے اس لئے ان میں کلیتاً نہ حبشی وزنجی اوصاف پائے جاتے تھے اور نہ ہی کلیتاً وہ سامی النسل کی خصوصیات وصفات کے حامل تھے ان کے رنگ کی سیاہی اور سر کے بالوں کی کثرت ناک کا چپٹا نہ ہونا گھنگریالے بال کا نہ ہونا اس بات کی علامات تھیں کہ ان کا تعلق مولد ہونے کے اعتبار سے مذکورہ ہر دو نسل سے تھا۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آپؓ حبشیوں کے سامنے سین کو شین بولتے اور پڑھتے تھے لیکن ثقہ حضرات نے اس خیال کی سختی سے تردید کی ہے اور کہا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اذان دیتے تھے جس میں شین اور صاد دونوں استعمال ہوتے ہیں اور وہ دونوں حروف کو صحیح طرح سے ادا کرتے تھے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جائے پیدائش میں اختلاف ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپؓ مکہ میں پیدا ہوئے تھے اور بعض کا خیال ہے کہ آپؓ کی پیدائش مقام سراۃ کی ہے اور اسی خیال کی اکثر لوگوں نے تائید کی ہے اور اس کی دو وجوہ ہیں ایک یہ کہ سراۃ یمن اور حبشہ دونوں کے قریب ہے دوسرے یہ کہ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب شادی کا ارادہ کیا تو سراۃ ہی کا رخ کیا ان کے سن پیدائش کے متعلق مستند ترین روایت یہ ہے

کہ آپ ہجرت سے تقریباً ۴۳ سال قبل پیدا ہوئے۔ بہر حال اس بارہ میں جو مختلف اقوال بیان کئے جاتے ہیں ان سے تقریباً دس سال کا تفاوت ظاہر ہوتا ہے حضرت بلال بن رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والدین معروف و مشہور شخصیتیں تھیں آپ کے والد کا نام رباح اور والدہ کا نام حمامہ تھا۔ جب کوئی شخص آپ کو پکارتے وقت ناراض ہوتا تھا تو ان کو ابن السوداء کہہ کر پکارتا تھا ان کی والدہ شاید سراۃ کی باندیوں میں سے تھیں یا مکہ کی باندیوں میں سے تھیں بشرطیکہ ان کی سراۃ کی پیدائش والی روایت کو درست نہ سمجھا جائے جن انگریزوں نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارہ میں کچھ لکھا ہے ان کا بیان ہے کہ انہوں نے کلمات توحید اپنی ماں سے سیکھے تھے اور یہی خیال حبشہ کے عیسائی باشندوں کا بھی ہے چنانچہ جب رسول خدا ﷺ نے علی الاعلان توحید کی دعوت دی تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑھ کر اس دعوت کو قبول کر لیا۔ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا یہ گمان صحیح ہو مگر ہمیں بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اس زمانہ میں حبشی لوگ بالعموم مسیحیت کو وثنیت سے قریب تر سمجھتے تھے اور اسلام کی دعوت توحید کو کچھ زیادہ خوش آمدید نہیں کہتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک بھائی تھا جس کو لوگ خالد کہا کرتے تھے اور جس کی کنیت ابورویحہ تھی لیکن بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسی قسم کا دینی بھائی تھا جیسا بھائی چارہ اور مواخاۃ کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ نے دوسرے صحابہ میں قائم کیا تھا اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت بلالؓ کے ایک بہن بھی تھی جس کا نام غفرہ تھا اور جو عمر بن عبداللہ کی آزاد کردہ باندی تھی اس کے علاوہ غفرہ کے بارہ میں ہمیں مزید کچھ معلوم نہیں۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پرورش مکہ میں قبیلہ قریش کی مشہور و معروف شاخ بنی جمح میں ہوئی، رسول اللہ ﷺ کے تینوں معروف موذن حضرت بلالؓ، حضرت ابو محذورہ اور حضرت عمرو بن کلثوم میں سے ابو محذورہ کا تعلق بھی قبیلہ بنو جمح ہی سے تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا یہ حسن اتفاق تھا کہ ہر سہ موذنوں میں سے دو کا تعلق ایک ہی قبیلہ بنو جمح سے تھا یا اس کی وجہ قبیلہ مذکورہ کے لوگوں کا آواز و غنا سے خصوصی لگاؤ اور شغف تھا۔ بنو جمح کے لوگوں کے بارہ میں مشہور تو یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں یہ لوگ اصحاب از لام و ایسار کہلاتے تھے یعنی ان لوگوں کا کام تیروں سے فال نکالنے، اور اس سے شگون لینے جوا کھیلنے اور جوئے کا گوشت تقسیم کرنا تھا نیز یہ لوگ چونکہ عبدالدار کے جتھے

کے لوگ کہلاتے تھے اس لئے جب کبھی عبد مناف (جد رسول اللہ ﷺ) اور عبد الدار میں کوئی جھگڑا ہوتا تھا تو بنو جمح کے لوگ عبد الدار کی حمایت کرتے تھے اسی لئے بنو جمح اور بنو عبد مناف میں بھی ہمیشہ اختلاف رہا کرتا تھا۔ چونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی پرورش و پرداخت بنو جمح جیسی قوم میں ہوئی تھی اس لئے اس سے ایک طرف ان کی طبعیت میں جاہلی رسوم وعبادات سے نفرت پیدا ہوئی اور اسلام کی طرف رغبت پیدا ہوئی اور دوسری طرف اس قوم کی ازلام وایسار کی مشغولیتوں سے نیز ان کے دجل وفریب اور جعلسازیوں کے کاروبار سے بھی ان کی سیرت وکردار کا پردہ فاش ہوا، اس کے علاوہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ان اخلاقی اقدار کے فرق وامتیاز کو بھی شدت سے محسوس کیا جو بنو جمح اور ان کے حلیف عبد الدار اور جد رسول ﷺ عبد مناف کے درمیان پایا جاتا تھا غرضیکہ ان تمام امور نے مل کر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بنو جمح سے کلیتاً کبیدہ خاطر کر دیا اور وہ ان کے حلقہ اثر سے نکل کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے اور رسول خدا ﷺ کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ یہ امر تحقیقی طور پر ثابت نہیں ہے کہ بنو جمح میں سے کون لوگ حضرت بلالؓ اور ان کی والدہ ماجدہ کے آقا و سردار تھے کہا جاتا ہے کہ وہ اس قبیلہ کی کسی محترم خاتون کی سرپرستی میں تھے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابو جہل کے بیٹوں کے پاس رہتے تھے بعض لوگوں کے نزدیک وہ امیہ بن خلف اور اس کی اولاد کے یہاں رہتے تھے۔

بہرحال اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کے بعد ان کے آقا کے ہاتھوں ان پر سخت مظالم ہوتے دیکھے تو انہوں نے ان کو ظالموں سے خرید کر ان اندوہناک مظالم سے نجات دلا دی، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کو پانچ اوقیہ سونے (اونس) میں خریدا گیا تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت بلالؓ کے آقا نے خریدنے کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا اگر تم ان کو ایک اوقیہ سونے میں بھی خریدتے تو میں ان کو تمہارے ہاتھ بیچ ڈالتا اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ نے جواب دیا اگر تم ان کے سو اوقیہ بھی طلب کرتے تو بھی میں ان کو خریدے بغیر نہ چھوڑتا بعض راویوں کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کو خریدا نہیں تھا بلکہ اپنے ایک غلام کے عوض آپ کو بدل لیا تھا مگر یہ ایسی روایت ہے جو بہت مشکوک ہے کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ایسے انسان نہ تھے

کہ اپنے کسی آدمی کو کسی مشرک کے حوالہ کر کے اس کے عوض اس کا کوئی آدمی قبول کر لیتے اس کے برعکس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رحمدلی، دینی ایثار اور طبعی و فکری خصوصیات کا ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ آپؓ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم واشارہ پاتے ہی خرید لیا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ اور ان جیسے دیگر کمزور مسلمانوں کی کفالت میں شرکت کرنا چاہی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، یارسول اللہ ﷺ میں نے تو ان کو خرید کر آزاد بھی کر دیا ہے اس کے بعد حضرت بلالؓ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا معتمد اور خزانچی بنالیا۔ اس کے بعد وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خزانچی بھی رہے اور اذان کے آغاز کے بعد مسلمانوں کے موذن اول مقرر ہوئے، آزادی ملنے کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آقاؤں کے ظلم و ستم سے تو نجات مل گئی لیکن معاشرہ کے دوسرے بدمعاشوں اور سماج دشمن عناصر سے نہ ان کو نجات ملی اور نہ ان جیسے دوسرے کمزور و بے سہارا مسلمانوں کو امان ملی یہ کمزور و ناتواں مسلمان اب اس لئے کافروں اور بدمعاش مشرکوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے تھے کہ ان کو اپنی حمایت کے لئے خاندانی عصبیت، قبائلی حمیت اور ہمدردی قطعاً میسر نہ تھی، مشرکین عام طور پر مسلمانوں کی طرح طرح کی اذیتیں دینے اور قسم قسم کے مصائب و آلام پہنچانے کے درپے رہتے تھے اور ان میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا حتیٰ کہ ایک دن انہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا بھی منصوبہ بنایا اور اس کے لئے تمام عرب قبائل کا تعاون واشتراک عمل حاصل کیا تاکہ بنو ہاشم تنہا اس ظلم و ستم کو روکنے اور تمام قبائل کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہ سکیں اس صورت حال کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازروئے شفقت صحابہ کرام کو مکہ سے ہجرت کی بطور خاص اجازت مرحمت فرمادی چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان لوگوں میں تھے جن کو ہجرت مدینہ کی اجازت ملی تھی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق خاص اور یار غار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے، تو مدینہ اگرچہ اپنے موسمی شدت اور نامناسب آب و ہوا کے لحاظ سے مکہ کے مہاجرین کے لئے مناسب نہ تھا لیکن وہی جگہ مسلمانوں کے لئے سب سے محفوظ دمامون اور ہر لحاظ سے بہتر ثابت ہوئی اور مشرکین مکہ کے ظالم پڑوس سے نکل کر آنے والے بے گھر مسلمانوں کے لئے امن و سلامتی کا گہوارہ

اور رحمت و محبت کا عظیم مرکز قرار پایا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عامر بن فہیرہ ایک ہی گھر میں اترے جہاں سب کو بخار ہو گیا جو غالباً ملیریا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو جب بخار سے ذرا نجات ملی تو انہوں نے گھر کے صحن میں بلند آواز سے کچھ اشعار گنگنانا شروع کیے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ مکہ اور اس کے قرب و جوار کے مکانات و اشجار پہاڑ اور وادیوں کی یاد ان کے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے ظاہر ہے جس مقام سے انسان کو اتنا لگاؤ ہو اس کے لئے ایسے برانگیختہ جذبات نہ تعجب انگیز ہیں اور نہ فطرت انسانی کے منافی، اس لئے کہ یہی وہ مقامات تھے جہاں حضرت بلالؓ کو ایام جاہلیت میں سختیوں اور اسلام لانے کی پاداش میں مصیبتوں اور اس کے بعد کی زندگی میں مسلسل خطرات کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اس کے باوجود اس پُر خطر ماحول میں بھی وہ اپنے ایمان وایقان کی خاطر زندگی کی کٹھن منزلیں ہنسی خوشی طے کرتے رہے کہ یہ مقامات انہیں بے حد مرغوب و محبوب تھے گو نئی جگہ ہجرت کرنے کے بعد ان کو خوش آمدید بھی کہا گیا اور وہاں ان کو امن و سلامتی بھی نصیب ہوئی۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ صرف مکہ اور مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ رہے بلکہ سفر و حضر اور تمام غزوات میں بھی ان کے ہمرکاب رہے اور جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد نبوی کی تعمیر اور اس میں پہلی اذان سننے کا شرف حاصل ہوا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس مسجد میں پہلی اذان دینے کا فخر نصیب ہوا تمام دوسرے موذنوں پر ان کو تقدم کا یہ شرف دوسرے موذنوں سے پہلے مشرف بہ اسلام ہونے نیز ان کی خوب صورت و بلند آواز اور حسن ادائیگی کی بدولت حاصل ہوا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قائم رہا۔ حضرت بلالؓ کا معمول تھا کہ جب وہ اذان سے فارغ ہو جاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ پر حاضر ہو کر حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح، یارسول اللہ کی صدا لگاتے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریف لاتے دیکھتے تو اقامت صلوٰۃ کہنا شروع کر دیتے تھے۔ حضرت بلالؓ کی اذان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ سورج ڈھلتے ہی اذان دیتے تھے مگر اقامت میں تھوڑی بہت تاخیر کرتے تھے البتہ وہ اذان کا صحیح وقت کبھی نکلنے نہیں دیتے تھے وہ اکثر و بیشتر بعض اشعار اس وقت ترنم سے گنگنا کر پڑھنا شروع کرتے جب وہ اذان دینے کے لئے چبوترہ پر چڑھتے ان اشعار سے بالعموم اپنی حالت زار استغفار اور

طلب رحمت کا اظہار ہوتا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے معمولات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ مسجد نبویؐ کی تعمیر سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک نیزہ لئے ساتھ ساتھ چلا کرتے تھے۔ اور جہاں اور جس وقت نماز کھڑی ہوتی تو وہ نیزہ حضور اکرم ﷺ کے سامنے گاڑ دیتے تھے یہ نیزہ ان نیزوں میں سے ایک تھا جو نجاشی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجے تھے جن میں سے ایک آپؐ نے خود رکھ لیا تھا اور دوسرے دو نیزے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کو عنایت کر دیئے تھے، ایک نیزہ کے متعلق حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خصوصیت سے ہدایت تھی کہ وہ اس کو ان کے ساتھ لے کر چلا کریں۔ چنانچہ وہ اس نیزہ کو ہمیشہ عیدین اور نماز استسقاء کے موقع پر ساتھ لے کر چلتے تھے اور جب نماز کھڑی ہو جاتی تھی تو اس کو آگے کھڑا کر کے زمین میں گاڑ دیتے تھے، یہ بھی روایت ہے کہ حضرت بلالؓ یہ نیزہ اسی طرح لے کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں بھی ان کے ہمراہ چلتے تھے پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کہنے کے مطابق یہ نیزہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں بھی اسی مقصد کے لئے استعمال کیا گیا اور اس کے بعد بھی نہ صرف ہر دور کے خلیفہ کے لئے نیزہ کے استعمال کا یہ طریقہ رائج رہا بلکہ اس کے بعد بھی ہر عہد کے سربراہ مملکت کے لئے یہ سلسلہ بدستور باقی رہا۔ مدینہ پہنچ کر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار اور مہاجرین کے مابین اخوت و مواخاۃ کے سلسلہ کی بنیاد ڈالی اور ایک مہاجر کو دوسرے انصاری کا دینی بھائی بنا دیا تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خالد بن رویحہ کا بھائی بنا دیا۔ لیکن بعض لوگوں کے بیان کے مطابق ابو عبیدہ بن الحارث ابن عبد المطلب کو یا ابو عبیدہؓ الجراح کو ان کا بھائی بنایا گیا لیکن ان دونوں باتوں میں اشتباہ ہونے کے باعث ہمارے نزدیک قابل ترجیح مواخاۃ حضرت بلال اور رویحہ رضی اللہ عنہما کے درمیان ہی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ ان کے درمیان بہر حال ایک ایسا تعلق تھا جو ان دونوں کی موت تک قائم رہا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے متعلق احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ امر بھی مترشح ہوتا ہے کہ آپؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تعلیم و تربیت کے لئے منتخب کر لیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آپؐ کی نظر میں تربیت و نصیحت اور تعلیم و تہذیب کی پوری پوری صلاحیت و استعداد رکھتے تھے۔

حضور اکرم ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کرتے تھے۔

مومن کا سب سے بڑا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے اور فرمایا کرتے تھے، "بلال فقیر بن کر زندہ رہو اور فقراء کی موت اختیار کرو۔"

چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا فاضل مال علیحدہ کرنا چاہتے تھے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مخاطب کر کے فرماتے تھے "بلال مجھے اس مال سے چھٹکارہ دلانے کی جلد تدبیر کرو" چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل میں ایسا اسوۂ حسنہ ملا کر زندگی بھر آپ کے نقش قدم پر چلتے رہے۔

مروی ہے کہ ایک روز رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں جنت میں اپنے آگے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے جوتوں کی چاپ سنی، نماز سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے حضرت بلالؓ سے دریافت فرمایا۔

"بلال یہ تو بتاؤ، اسلام لانے کے بعد اجر کے اعتبار سے تم کس عمل کی بابت زیادہ پُر امید ہو؟ میں نے ایک رات خواب میں تمہارے دونوں جوتوں کی چاپ جنت میں سنی ہے۔ اس کے جواب میں حضرت بلالؓ نے اپنے زہد و اتقا کا ذکر کیا نہ اپنے جہاد کا نہ اپنے مصائب و آلام پر صبر کا اور نہ ہی اپنی امانت و دیانت اور نہ اپنے تسلیم و رضا کا بلکہ جواب میں صرف اس قدر کہا "میرے نزدیک اجر و ثواب کے لحاظ سے کوئی عمل طہارت و پاکیزگی سے بڑھ کر نفع بخش نہیں ہے میں طہارت و صفائی کا ہر وقت اس قدر اہتمام رکھتا ہوں کہ صبح سے شام تک کسی وقت کی نماز کے لئے بھی مجھے از سر نو وضو یا طہارت حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔"

نبی اکرم ﷺ کی نظر انتخاب حضرت بلال رضی اللہ عنہ جیسے مومن صادق اور حق پرست امین پر اس لئے پڑی کہ اس جوہر قابل میں تعلیم و تربیت اور تقلید و اتباع کی نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ خلوص و محبت اور دیگر فضائل انسانی کی خصوصیات بکثرت موجود تھیں یہی وجہ ہے کہ اگرچہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ زمانہ جنگ و امن اور سفر و حضر میں ہر وقت بحیثیت ایک جاں نثار باڈی گارڈ کے ساتھ رہا کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس طرح کا محافظ نہیں سمجھا جیسا کہ امراء و سلاطین کے یہاں سمجھا جاتا ہے حضرت بلال رضی

اللہ تعالیٰ عنہ نے از خود اپنے ذمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و نگرانی کے فرائض لے لئے تھے اس لئے کہ ان کو آپؐ کے ہمہ وقتی دیدار اور ان کی سچی رفاقت و مصاحبت سے روحانی سرور اور قلبی سکون حاصل ہوتا تھا۔ گرمیوں میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر پر روانہ ہوتے تھے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سفر کے دوران جب دھوپ سخت ہو جاتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ پر سایہ کرنے کے لئے کسی نقشین کپڑے کا بندوبست کیا کرتے تھے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ان سے اس کی فرمائش نہیں کرتے تھے۔ اور آپؐ سے اپنی بے پناہ محبت کے باعث بحالت جنگ میدان کارزار میں آپؐ کے لئے چمڑے کا ایک خیمہ نصب کر دیتے تھے جہاں سے حضور اکرمؐ ہر چیز کا مشاہدہ فرما سکتے تھے اور احکامات جاری کر سکتے تھے اس کے باوجود حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، خیمہ رسولؐ اور میدان جنگ کے درمیان آمدورفت رکھتے تھے اور حضور اکرم ﷺ کو تمام حالات سے واقف رکھتے تھے اور احکام و اوامر کو بجالانے میں نہ ان کو کوئی دشواری پیش آتی تھی اور نہ ہی کسی قسم کے خطرہ کو نگاہ میں لاتے تھے اسی کے ساتھ وہ اپنے روزمرہ کے معمولات، پنج وقتہ اذان دینے اور نمازوں اور مجالس حدیث و عظ وغیرہ میں کسی قسم کا خلل بھی پڑنے نہیں دیتے تھے خانہ کعبہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خانہ کعبہ پر چڑھ کر اذان دینے کا حکم دیا آپ نے فوراً حکم رسولؐ کی تعمیل کی۔ آج مشرکین مکہ کو اپنے باپ دادا کی خوش قسمتی پر بڑا رشک آرہا تھا کہ وہ آج مسلمانوں کے ہاتھوں یہ توہین آمیز منظر دیکھنے کو زندہ نہیں تھے جو آج انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑ رہا ہے۔ اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو آپؐ کے ساتھ تین خوش نصیب آدمی اور بھی تھے ایک خانہ کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہؓ، دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنی حضرت اسامہ بن زیدؓ اور تیسرے خود حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ آپؐ کے وصال تک بحیثیت مجاہد جنگوں میں شریک رہے، اور آپؐ کے وصال کے چند دن بعد تک اذان بھی دیتے رہے لیکن اس کے بعد حضرت بلالؓ نے اذان دینے سے انکار کر دیا اور اپنے اس انکار پر مصر بھی رہے اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ اذان کے دوران اشھدان محمداً رسول اللہ کہتے تھے تو بے ساختہ رونے لگتے تھے اور آپؓ کے ساتھ سننے والے بھی رونے لگتے تھے انہیں اس مقام

پر کھڑے ہو کر جہاں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اور چہرۂ انور کو دیکھتے رہنے کا فخر حاصل رہتا تھا اب اذان دینا گوارا نہ تھا چنانچہ مکہ اور مدینہ سے بے انتہا محبت ہونے کے باوجود وہاں سے چلے جانے پر مجبور ہو گئے اور ساٹھ سال کی عمر میں جو آرام سے زندگی گزارنے کا وقت ہوتا ہے جہاد کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے معتبر روایات کے مطابق انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ترک اذان کے ساتھ خود ان سے بھی رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے شدید اصرار پر مجاہدین کے ساتھ ان کو شام جانے کی اجازت مرحمت فرمادی چنانچہ وہاں پہنچ کر وہ متعدد معرکوں میں شریک بھی ہوئے۔ جن کی تفصیلات کا ہمیں علم نہیں ہے اس کے بعد وہ دمشق کے قرب وجوار میں حکومت سے تھوڑی سی زرعی اراضی لے کر آباد ہو گئے اور وہیں اس پر کاشت کاری کرنے لگے اور اسی کی پیداوار پر گزر بسر کرنے لگے اس کے بعد ان کے متعلق کوئی اطلاع بجز اس کے نہیں ملی کہ کبار صحابہ کی دعوت پر انہوں نے ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خاطر اذان بھی دی تھی اور ایک مرتبہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے محاسبہ کے واقعہ کے دن سب کو نظر آئے تھے جو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے روبرو مجلس حکم میں پیش آیا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات تقریباً ستر سال کی عمر میں ہوئی۔ اس لئے کہ ترجیحی قول کے مطابق وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہم عمر تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کی موت عمواس کے طاعون میں ہجرت کے بیسویں یا اکیسویں سال ہوئی وہ اپنی موت کے بڑے خواہاں تھے کیونکہ جیسا کہ آخری وقت میں ان کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات سے ظاہر ہوتا تھا وہ اپنی موت کو اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ملاقات کا سبب سمجھتے تھے، ان کی موت کے وقت ان کی بیوی ان کے قریب موجود تھیں جو بچوں کی طرح چیخ چیخ کر رو رہی تھیں اور جب وہ احزنا، ہائے کیسا غم ہے، کے الفاظ کے ساتھ ماتم کرتی تھیں۔ تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جواباً وافرحا، کتنی خوشی کی بات ہے، سے جواب دیتے تھے، کل تو میں اپنے پیارے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے جا ملوں گا۔"

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وفات دمشق میں ہوئی اور باب الصغیر کے نزدیک دفن

ہوئے آپ کی قبر آج بھی مشہور اور مرجع خلائق ہے حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو اذان اول کے انقطاع کے بعد عرصہ دراز تک دمشق میں اپنی مسحور کن اذان سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے رہے اس کا اندازہ اس بے پناہ محبت و عقیدت کے جذبات سے لگایا جاسکتا ہے جو صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے دلوں میں ان کے لئے موجزن تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ بڑے بڑے علماء و مشائخ کے دلوں میں بھی ان کی درد بھری آواز سے سخت ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ اس قدر بے تابانہ روتے تھے کہ ان کی سفید براق سی داڑھیاں روتے روتے تر ہو جاتی تھیں۔ اگرچہ وہ لوگ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ یہ آواز گوشت پوست سے بنے ہوئے ایک شخص کے گلے سے نکل رہی ہے جس سے بظاہر کسی اضطراب و بے چینی پیدا نہیں ہونی چاہئے مگر اس شعور کے باوجود جب وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سنتے تھے تو اس میں ان کو وحی الغیب کی کیفیت محسوس ہوتی تھی چنانچہ وہ پوری توجہ اور غور سے ان کی اذان کی آواز کو سنتے تھے اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ ایسی مسحور کن اور دلنشیں آواز صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و موجودگی میں ہی سنی جاسکتی تھی اور جس کو انہوں نے بار بار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و موجودگی میں سنا بھی تھا۔ اگر ایسے سحر آفریں ماحول میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے صوتی اثرات سے لوگوں میں ملاء اعلیٰ سے قرب کا احساس ہو جاتا ہو تو اس میں حسرت و استعجاب کی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ حضرت بلالؓ کی روح پر فتوح پر اپنی بے پایاں رحمتوں کا نزول فرمائے آمین! آج تک تاریخ اسلام میں داعی اسماء کے معزز لقب سے نوازے اور یاد کیے جاتے ہیں اور اس میں شک بھی کیا ہے انہوں نے دعوت الی اللہ کا روحانی نعرہ اتنی زور سے بلند کیا کہ زمین کی پستی میں رہنے والے ایمان و اخلاق کی سطح مرتفع اور روحانیت کے افق اعلیٰ پر پہنچ گئے اس لئے اگر اس عہد کے مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات اور صوت بلالؓ کو ہر جگہ اور ہر وقت لازم و ملزوم سمجھتے تھے تو غلط نہ تھا بہرحال حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مختصر سیرت کے بارہ میں جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ جس طرح اپنی دینی و روحانی زندگی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی و ہدایت کے محتاج تھے اسی طرح وہ اپنی دنیوی زندگی کی ضروریات کے لئے بھی ہمیشہ اسی بارگاہ عالی مقام کی طرف رجوع کرتے تھے چنانچہ صحابہ میں سے کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ کسی صحابی کے بارہ میں موقع بے موقع کوئی بات کہہ سکے یا سفارش کر سکے، یہ حق بھی صرف نبی

محترم ﷺ کے موذن و ہم نشین اور قلبی دوست حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہی زندگی بھر حاصل رہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیشت وروزگار کا بندوبست فرمایا تھا ان کی آزادی، ذہنی تربیت اور دینی تعلیم کا اہتمام بھی کیا تھا۔ مختلف روایتوں کے مطابق حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کے مطابق شادی بھی کی۔ ایک روایت کے مطابق ایک مرتبہ بنوابو بکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہماری فلاں بہن کو اپنے حبالہ عقد میں لے آیئے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلالؓ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے، اس پر وہ لوگ خاموش ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ آئے اور انہوں نے دوبارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی بہن کے نکاح کی درخواست کی، اس کے جواب میں آپؐ نے پھر وہی کلمہ دہرایا اور کہا کہ بلالؓ کے متعلق آخر تمہارا کیا خیال ہے۔ اور جب وہ لوگ اسی درخواست کے ساتھ تیسری مرتبہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے جواب میں پھر وہی بات کہی کہ ”آخر اس جنتی شخص کے بارہ میں تم لوگ کیوں نہیں سوچتے ہو، اس سے اپنی بہن کا نکاح کر دو۔“

بظاہر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اگرچہ ایک سے زیادہ شادیاں کیں لیکن انہوں نے اپنا کوئی وارث و جانشین نہیں چھوڑا۔ قتادہ کی روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنی زہرہ کی ایک اعرابی عورت سے شادی کی ایک دوسری روایت کی رو سے ان کی بیوی کا نام ہندہ الخولانی تھا اور وہ یمنی خولانیوں میں سے تھیں نہ کہ شامی خولانیوں میں سے کیونکہ وہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شام کی طرف ہجرت کرنے سے قبل ان کے عقد میں آچکی تھیں ابن اسحاق نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ کا ذکر غزوہ بدر کے مجاہدین میں بایں الفاظ کیا ہے ”حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آزاد کردہ غلام بلالؓ کو جو بنوجمح کے مولدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ امیہ بن خلف سے خرید اتھا آپ کا نام بلالؓ بن رباح ہے اور انہوں نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا ہے۔“

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اپنا کوئی صلبی جانشین نہیں چھوڑا لیکن انہوں نے اپنے بعد اذان کی صورت میں ایسی لازوال روحانی میراث چھوڑی ہے جو دن رات میں پانچ بار ہر مقام پر سنی جا سکتی ہے۔ اذان سننے والا کبھی کوئی شخص حق کے اس داعی و منادی اور موذن اول کو فراموش نہیں کر سکتا۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسلام

ایمان خواہ کسی قسم کا ہو ایک متجاوز شے ہے یعنی وہ نہ فرد واحد کی ذات تک محدود ہوتا ہے اور نہ ہی کسی مصلحت پر موقوف ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے ایمان کو ایمان نہیں کہا جائے گا جو انفرادی مصلحت کے گرد گھومتا ہو خواہ اس میں کئی افراد ہی شامل کیوں نہ ہوں اس لئے کہ انسان ایمان کی خاطر مصلحت کو قربان کر دیتا ہے لیکن جب انسان مصلحتوں کا تابع ہو جاتا ہے تو ایسا نہیں کر پاتا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ کبھی کبھار انسان کی مصلحت کی خاطر ایمان کو بھی قربان کر دیتا ہے لیکن اس سے اس امر کی ہرگز نفی نہیں ہوتی کہ ایمان مصلحت سے عظیم تر ہے اس سے ہم پر دو حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں ایک یہ کہ ایسا انسان اعلیٰ اور افضل شے کے عوض ادنیٰ اور کمتر شے کا سودا کرتا ہے دوسرے یہ کہ ایسا شخص ضعیف الاعتقاد ہوتا ہے اور اس میں ایمان کی استعداد و صلاحیت بنیادی طور پر کمزور ہوتی ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان کبھی کسی جلد یا بدیر مصلحت کی اساس و بنیاد پر قائم نہیں ہوتا اور اس واضح حقیقت کے ثبوت میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ لوگ اپنے ایمان کی خاطر گو کم ہی سہی مصلحتوں کو قربان کر دیتے ہیں۔

بہرحال اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک انسان اگر کسی مصحلت کی خاطر ایمان کو بھلا بیٹھے یا اس کو نظر انداز کر دے تو اس کی ہم یہی توجیہہ کریں گے کہ ایسا شخص مصلحت سے مغلوب ہو گیا اور اپنے ایمان میں کمزور ثابت ہوا لیکن اگر کوئی شخص ایمان کی خاطر مصلحت کو یکسر نظر انداز کر دے تو اس کی صرف یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ ایمان اور مصلحت حقیقت میں دو مختلف و متضاد چیزیں ہیں نیز یہ کہ مصلحت خواہ قوی ہو یا کمزور ایمان سے کلیتاً علیحدہ اور ممتاز شے ہے اس لئے یہ کہا جائے گا کہ جب آخرت کی مصلحت انسان کے پیش نظر

ہوتی ہے تو اس کے باعث انسان دنیوی مصلحت کو نظر انداز کر دیتا ہے اس لئے کہ آخرت کی مصلحت تو خود انسان کے ایمان بالغیب کا طبعی تقاضا ہے جسے بہرحال مصلحت پر فوقیت حاصل ہے بہر حال اس کے باوجود ہمارے اس زمانہ میں کچھ لوگ مثلاً کارل مارکس کے متبعین جو مادیات میں یقین رکھتے ہیں اور اس محسوس مادی دنیا کے سوا ہر چیز کے منکر ہیں ان کا کہنا ہے کہ تمام ادیان و مذاہب اور ہر وہ شے جو انسان کے ضمیر میں خلش پیدا کرتی ہے وہ انسان کی مادی زندگی کی ہی ایک شکل اور اس کا ایک عکس ہے جس کے بعد نہ حیات بعد الممات کوئی شے ہے اور نہ وہاں نفس و روح کا کوئی سوال ہے اس کے باوجود ان میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے خیالات کے باعث ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں، جلاوطنی کا سامنا بھی بعض اوقات کرتے ہیں اپنی زندگی کو خطرہ میں بھی ڈالتے ہیں حتیٰ کہ اپنے معتقدات و نظریہ کی حفاظت کی خاطر اور دوسروں کے معتقدات کے انکار کے باعث اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یہ امر تو کسی طرح معقول نہیں کہ انسان محض اس لئے اپنی زندگی کو داؤں پر لگا دے کہ اس کو عمدہ اور نفیس کھانوں کی خواہش ہے یا اسے آسودہ اور خوش حالی کی زندگی کی تمنا ہے اور اس سے بھی زیادہ نامعقول بات یہ ہے کہ انسان اس لئے اپنی جان گنوا دے کہ مرنے کے بعد اس کو عیش و آرام کی زندگی اور نفیس اور اعلیٰ نعمتیں ملیں گی۔ لیکن اس کے باوجود انسان زندگی کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ایسی صورت میں اس کے سامنے اس مسئلہ نفع نقصان کے حساب لگانے یا بڑی مصلحت کے مقابلہ میں چھوٹی مصلحت کا نہیں ہوتا بلکہ وہ اس لئے اس قربانی پر خوشی خوشی آمادہ ہو جاتا ہے کہ اس کا مقابلہ ایسی قوت سے آپڑا ہے جس کے ہاتھ میں خود اس کی نکیل ہے اور وہ قوت جس طرف چاہتی ہے اس کو موڑ دیتی ہے خود اس کے اندر اس قوت کی مزاحمت کا حوصلہ نہیں ہوتا کہ جس طرف کو چاہے اس کو موڑ دے، دنیا میں لاتعداد عقائد اور بکثرت عبادتیں بھی پائی جاتی ہیں لیکن ایسا کوئی عقیدہ آج تک مشاہدہ میں نہیں آیا جو زندگی کی قربانی تو چاہتا ہو مگر ایمان بالحق یا باطل کے جذبے سے خالی ہو، اسی طرح ایسے عقیدہ کا بھی وجود نہیں ملتا جو زندگی کی قربانی طلب کرتا ہو اور اس کا وجود ایسی منفعت پر مبنی ہو جو صرف اس کی ذات تک محدود ہو اور کسی دوسرے انسان تک اس کا فیض نہ پہنچتا ہو۔ بہرحال ایسی منفعت فرد واحد سے متجاوز ہو کر صلائے عام کے طور پر دوسروں کے لئے بھی عام ہو جائے تو اس وقت یہ ایسا مسئلہ حق بن جاتا ہے جو مخصوص مفاد

کے علاوہ افراد کے وجود سے گزر جاتا ہے غرضیکہ ایمان حق کے مثبت شعور کا نام ہے جس میں کسی مصلحت کی آمیزش نہیں ہوتی۔ البتہ ایمان سے قبل کبھی کوئی مصلحت عقیدہ کے راستہ میں حائل ہو جاتی ہے اس لئے کہ وہاں مصلحت تو موجود ہوتی ہے لیکن وہاں ایمان کا وجود نہیں ہوتا ہے لیکن جب ایمان اور عقیدہ دونوں ایک ساتھ موجود ہوں تو یہ دو مختلف اور علیحدہ چیزیں ہوتی ہیں ایک نہیں اور ان کا تعلق دو مختلف معدنوں اور مرکزوں سے ہوتا ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام سے مذکورہ بالا حقیقت کا پورا نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے ہم چاہتے ہیں غلاموں کے معاملہ میں اسلام کو جو فضیلتیں اور خصوصیتیں حاصل ہیں ان کا تفصیل سے جائزہ لیں لیکن ان کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہاں ایک دوسری حقیقت بھی اجاگر ہو کر سامنے آجائے اور وہ یہ ہے کہ یہاں سوال محض غلاموں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے سبب کا نہیں ہے جسے بالعموم حق اور جمال حق کے شعور یا باطل پر غلبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بہر حال اسلام کی راہ میں ان غلاموں کو ایسے اندوہناک مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا جیسا دوسرے غلاموں اور کنیزوں کو مشرکین کے ہاتھوں کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

سب سے پہلے جو آٹھ بزرگ مشرف بہ اسلام ہوئے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اور حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اسلام کے اولین راویوں کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان جیسے دوسرے مسلمانوں کو چھوڑ کر جنہیں اپنی قوم کی مدد و حمایت حاصل تھی باقی لوگوں کو مشرکین نے اپنی گرفت میں لے کر سخت اذیتیں دینا شروع کیں، وہ ان کو لوہے کا لباس پہنا

کر تیز اور سخت دھوپ میں بٹھا دیتے تھے اور مشرکین میں سے ہر شخص اول فول بکتا ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتا ہوا آتا تھا لیکن حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کا معاملہ ہی دگرگوں تھا انہوں نے اپنی ہستی کو فنافی اللہ کر لیا تھا اور ہر قسم کی سختیوں کو خاموشی سے جھیلنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا چنانچہ ظالم مشرکین ان کو لڑکوں کے حوالہ کر دیتے تھے جو ان کو مکہ کی گھاٹیوں میں گلے میں رسی ڈال کر کھینچے پھرتے تھے لیکن اسلام کے شیدائی اور محمد عربی ﷺ کے جاں نثار حضرت بلالؓ پھر بھی احد احد کی ہی صدا لگاتے رہتے تھے۔ اور ہر مصیبت اور ہر اذیت پر راضی برضائے الٰہی رہتے تھے اور زبان سے اف تک نہ کرتے تھے۔

طبقات ابن سعد میں سند کے ساتھ مذکور ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ انتہائی بے بس و بے کس مسلمانوں میں سے تھے اور جس دن وہ مسلمان ہوئے تھے سخت ترین مظالم کا نشانہ بنے ہوئے تھے تاکہ دین اسلام سے تائب ہو جائیں لیکن اس کے باوجود مشرکین ان سے وہ کلمات کہلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکے جو وہ ان سے کہلوانا چاہتے تھے۔ امیہ بن خلف ان کو خصوصیت سے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا کرتا تھا جس شدت سے ظالموں کا عذاب بڑھتا جاتا تھا اتنی ہی شدت اور زور سے وہ احد احد کا نعرہ بلند کرتے تھے یہ سن کر جب ظالم ان سے کہتے تھے وہ کہو جو ہم کہتے ہیں تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے جواب میں کہتے تھے "یہ تو مجھے کہنا نہیں آتا" اس پر وہ ان کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے ان کے سینہ پر تپتے ہوئے گرم پتھر رکھتے اور اوپر سے دباغت کیا ہوا چمڑا ان کو اڑھا دیتے تھے۔ اور جب وہ ان سے لات و عزیٰ کہلوانا چاہتے تو وہ جواباً احد احد کہتے تھے۔" جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی یہ حالت زار دیکھی تو ظالم مشرکین سے کہا، اس غریب انسان پر آخر اتنا ظلم کیوں کر رہے ہو؟ اور بالآخر انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس مصیبت عظمٰی سے نجات دلائی اور ان کو سات اوقیہ سونے میں خرید کر آزادی کی نعمت سے مالامال کر دیا۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ ابو جہل شام کو جب گھر آتا تو آتے ہی حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو گالیاں دینا اور فحش بکنا شروع کر دیتا حتیٰ کہ ایک روز اس نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو تیر مار کر شہید کر دیا۔ یہ اسلام کی راہ میں پہلی جانی قربانی تھی اور اسلام لانے والے تمام مردوں اور عورتوں میں پہلی مسلمان عورت کی شہادت تھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے بعد جن روح

فرسا مظالم اور ہولناک اذیتوں کا مقابلہ ایسی صورت حال میں نہایت خندہ پیشانی سے کیا جب کہ ان کو اسلام کی عطا کردہ مراعات و مواعید کا علم بھی نہ تھا۔ انہوں نے کبھی ان چیزوں کے متعلق غور و فکر کرنے اور تحقیق و جستجو کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی، اسلام نے قیدیوں اور غلاموں کے سلسلہ میں کیا احکام نافذ کیے ہیں ان کا تفصیلی علم بھی اس زمانہ میں بہت کم لوگوں کو تھا۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ تو دوسرے غلاموں اور کنیزوں کی طرح بالکل ہی ان مراعات سے ناواقف تھے پھر کسی شخص کے دل میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اذیت ناک حالات کو دیکھ کر یہ خیال کیسے پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید انہوں نے ایام جاہلیت کے لوگوں کی بدمعاملگی اور اسلام کے حسن معاملہ اور تالیف قلوب کو دیکھ کر اور دونوں کا موازنہ و مقابلہ کر کے نئے دین کو اختیار کر لیا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کی وجہ نہ مشرک آقاؤں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا اور ظالموں کے ظلم و ستم سے رہائی پانا تھی اور نہ ہی قبل از اسلام مشرکین کی بدمعاملگی اور بدسلوکی اس کا سبب تھی اور بالفرض اگر حسن معاملہ ہی دین جدید کو اختیار کرنے کی وجہ ہوتی تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس وقت تک اپنے مسلمان ہونے کا انتظار کر سکتے تھے جب تک کہ ان کے آقا مسلمان نہ ہو جاتے تاکہ ان کو مستقبل میں ان سے اچھے سلوک کی توقع ہوتی یا اس وقت تک مسلمان نہ ہوتے جب تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت کافی نہ ہو جاتی تاکہ وہ استقبال کرنے والے اور نعرہ تحسین بلند کرنے والے مجمع میں علی الاعلان اپنے اسلام کا اعلان نہ کر سکتے چند بے یار و مددگار کمزور مسلمانوں میں شامل ہو کر اپنے لئے بے پناہ مصائب و آلام کو ہرگز دعوت نہ دیتے پھر اس سے بھی عجیب اور طرفہ خیال یہ ہے کہ اسلام نے چونکہ آزاد اور غلاموں کے مابین فرق و امتیاز مٹا کر مساوات قائم کر دی ہے اس لئے غلام جلد حلقہ بگوش اسلام ہو گئے لیکن انہیں اس کے ساتھ یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ اس قسم کی مساوات کو تو انہیں تکبر میں مبتلا کر کے اسلام میں داخل ہونے سے قطعی روک دینا چاہئے تھا حالانکہ دین جدید کی خوشخبری پا کر جس طرح غلام داخل اسلام ہوئے اسی طرح احرار و آزاد لوگوں نے بھی اسلام کو خوش آمدید کہا اور اگر بلال و صہیب رضی اللہ عنہما اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے دین اسلام کو قبول کرنے اور ایمان لانے کی یہی ایک وجہ تھی کہ اس نے انہیں اور ابوبکر و عمر، حمزہ و عثمان، علی اور طلحہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے برابر لا کھڑا کر دیا تھا تو ان

لوگوں کے ایمان قبول کرنے کی کیا مصلحت ہوگی جو اپنی بلند حیثیت اور اعلیٰ قدر و منزلت کے باوجود اپنی خوشی سے کمزور و بے کس غلاموں کی صف میں آکھڑے ہوئے۔ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جو فخر و مباہات کے اعتبار سے عرب کے تمام قبائلی سرداروں میں نہایت ممتاز حیثیتوں کے مالک تھے غرضیکہ حق اور اس کے باعث نفس و روح کی تسکین ایسی عظیم شے ہے جو ہر جدید عقیدہ اور ہر ایسی مصلحت انسان کی توجیہہ کی بنیاد بن سکتی، جو افراد کے مفاد سے بالاتر ہو۔ چنانچہ ہمیں ایمان وہیں ملتا ہے جہاں نفس کو حق محبوب اور باطل مکروہ معلوم ہوتا ہے، خواہ حق کی محبت اور باطل کی کراہت و نفرت میں کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دینی پڑیں یا خود زندگی ہی اس راہ میں کیوں نہ ہاتھ سے چلی جائے، پس نہ غلام اس لئے دولت ایمان سے سرفراز ہوئے ہیں کہ اسلام ان میں اور احرار میں برابری اور مساوات قائم کرتا ہے اور نہ احرار و آزاد اس لئے ایمان لائے کہ اسلام نے اونچ نیچ امیر و غریب اور سماجی حیثیت کا فرق مٹا کر احرار و غلاموں میں مساوات قائم کر دی ہے مساوات کے اس آخری مقصد میں لوگوں کے ایک فریق کی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے اور ایمان اور مصلحت ہمیشہ دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں اور جن کا تعلق دو مختلف معاون سے ہوتا ہے پس مصلحت ایسی شے ہے جس کا تعلق فرد کی پوری زندگی یا اس کی زندگی کے کسی جزء سے ہوتا ہے لیکن ایمان ایسی ابدی اور دائمی شے ہے جو فرد واحد سے متجاوز کر جاتی ہے حتیٰ کہ کبھی ایمان کی راہ میں مصلحت اور زندگی دونوں قربان کر دینا پڑتی ہیں کیا بت پرستی اور بعض آسمانی مذاہب میں ایسے لوگ نہیں پائے جاتے جن کا ایمان اپنے ایسے ارباب اور ناخداؤں پر ہوتا ہے جو ان کے اور ان کے آقاؤں کی عزت و وقار میں نہ صرف اس دنیا میں بلکہ دوسری دنیا میں بھی بڑا فرق سمجھتے ہیں۔

اور کیا حضرت بلال رضی اللہ عنہ لات و عزیٰ اور ایام جاہلیت کے دوسرے ارباب پر ایمان نہیں رکھتے تھے جن سے نہ خود ان کو کبھی عدل و انصاف کی توقع تھی اور نہ ہی اپنے اور دوسرے غلاموں کے لئے جابر آقاؤں کے مقابلہ میں ان سے عدل و مساوات کی امید تھی چنانچہ جب ان ارباب اور ناخداؤں کے مختلف طرز عمل نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بالکل بدگمان کر دیا تو ان کا حسن ظن خدائے واحد کی یکتا ذات والا صفات کے ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا جس نے ان کو جاہلیت کے دین سے یکسر برگشتہ و بددل کر دیا اور خدائے قدوس کی وحدانیت کا نقش ان کے دل پر ایسا بیٹھا کہ ان کی زبان سے کلمہ توحید کا ورد جاری ہو گیا اور اس

ذکر نے ان کے دل میں اپنا گھر کر لیا، اس ذکر میں اس وقت اور بھی شدت پیدا ہو جاتی تھی جب ان کو بد بخت ظالم آقاؤں کی نظر کے سامنے ہولناک مظالم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ غرضیکہ خدا کی وحدانیت اور توحید سے بھرپور صرف ایک مختصر کلمہ "احد" ہی دین جدید سے عشق اور دین قدیم سے بیزاری اور نفرت کا سبب بنا اور اس مختصر سے کلمہ صادق نے ان کے دل میں ایمان صادق کی ایسی شمع روشن کر دی جس نے ان کی روح کو منور اور قلب کو روشن کر دیا۔ اور اگر وہ احد کی بجائے رحیم کہنا شروع کر دیتے تو شاید لوگ یہ سمجھتے کہ یہ کسی ایسے بت کا نعرہ لگا رہے ہیں جو صفت رحم سے متصف ہے یا یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ظلم و ستم کے شدید لمحات میں اس لئے رحیم کے نام کی دہائی دے رہے ہیں اور ظالموں کو اس کی یاد دہانی کرا رہے ہیں لیکن چونکہ وہ کلمہ توحید کی تکرار جاری رکھے ہوئے تھے اور اس کے سوا کوئی بھی دوسرا کلمہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ ایک طرف اپنے معبود کی ایک ایسی صفت کا برملا اظہار کر رہے ہیں جو ارباب جاہلیت میں سے کسی میں بھی نہیں پائی جاتی ہے اور دوسری طرف اس سے اس یگانہ صفت کا اظہار ہوتا ہے جو ایمان کو خالص ایمان بالحق بناتی ہے اور جہاں رحمت مغفرت یا جزا کا انتظار نہیں ہوتا ہم یہ نہیں کہتے کہ ایمان اور مصلحت کبھی یکجا جمع نہیں ہوتے اور نہ ہی ہم یہ کہتے ہیں کہ مومن کے دل میں کبھی مصلحت کا خیال نہیں گزرتا ہے یا عبادت و عقائد کی تبدیلی میں مصلحت کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ مصلحت تو بہت سے لوگوں کو دین جدید کے قبول کرنے سے بھی روک دیتی ہے اور کبھی ذہن کو ایسی باتوں کو توجہ سے سننے کی طرف مائل کر دیتی ہے جس کے بعد خوشی و راحت اور اطمینان و تصدیق کی دولت ملتی ہے اسی طرح مصلحت کا تعلق کبھی فرد واحد سے ہوتا ہے اور کبھی ہزاروں لوگوں سے، لیکن مصلحت اور ایمان کو خیر عام کے جذبہ سے ایک ساتھ جمع بھی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مصلحت غیر ایمان ہے اور یہ دونوں علیحدہ ہو جاتے ہیں اور کبھی مل بھی جاتے ہیں اور اگر مصلحت ہی ایمان ہے تو ایسی جگہ مصلحت کا وجود تو ہو گا لیکن وہاں ایمان کا مطلقاً گزر نہ ہو گا انسان کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ایمان کو وسیلہ بنائے بغیر مصلحت کے لئے تگ و دو کرے اور یہ بھی بہت کافی ہے کہ وہ مصلحت سے چمٹا رہے مگر اس مصلحت کو کھینچ کر وہاں تک نہ لے جائے جہاں موت کو محبوب سمجھا جاتا ہے، بہرحال ایمان ہر وقت اور ہر زمانہ میں پایا گیا ہے اور یہ جزا اور صلہ کے انتظار اور

امید کے ساتھ بھی پایا گیا ہے اور جزا اور صلہ سے مایوسی کی حالت میں بھی اس کا وجود عنقا نہیں ہو رہا ہے اس لئے یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ فلاں شخص ایمان لایا ہے اور اس کے ایمان لانے میں ایک مصلحت پوشیدہ ہے بیشک وہ مصلحت کے ساتھ دوسری شے کو شامل کر رہا ہے اور وہ سب کچھ ایمان کا سہارا لینے کی خاطر کر رہا ہے مگر حاشا وکلا عرب کے تپتے ہوئے ریگزار اور گرمیوں کی تیز اور چلچلاتی دھوپ میں بہ جبر لٹائے ہوئے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس شخص کا سا قطعاً نہ تھا۔ جس کا مقصد ظالم آقاؤں کے ظلم و ستم سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہوتا ہے اسی طرح ان کی کیفیت جب کہ وہ احد احد کی تکرار کرتے تھے اس شخص سے ملتی جلتی بھی نہ تھی جو اگرچہ دین جدید کو اختیار کیے ہوئے ہے لیکن نہ ماضی و حال کے دینوں کے مابین فرق و امتیاز سے واقف ہے اور نہ ہی دین جدید کی خوبیوں کے متعلق بجز غلاموں پر دنیوی اور اخروی رحم و کرم کے اس کو کوئی علم ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ یہ ظالم لوگ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل ہی کر ڈالتے کیونکہ نہ وہ ان کے بتوں کی تعظیم کے لئے تیار تھے اور نہ ہی سکوت اختیار کرتے تھے اور غالباً وہ اب تک ان کو قتل کر بھی چکے ہوتے اگر ان کو بار بار یہ خیال نہ آتا کہ ان کے قتل سے ان کی اچھی قیمت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گے اور ابو جہل نے تو اپنی باندی حضرت سمیہ کو شاید اسی لئے قتل کر دیا تھا کہ وہ بوڑھی ہو چکی تھیں اور قابل فروخت نہیں رہی تھیں اور نہ ہی ان کو کسی دوسری باندی کے عوض بدلا جا سکتا تھا لیکن انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس مصلحت سے قتل نہیں کیا کہ یہ لوگ بڑے کار آمد تھے اور ان کو بہ آسانی فروخت بھی کیا جا سکتا تھا بہر حال حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بالآخر اس وقت ضرور ان کے ہاتھوں قتل ہو جانا تھا جب وہ ان سے بالکل مایوس ہو جاتے اور کوئی مشرک ان کو خریدنے کے لئے آمادہ نہ ہوتا غرضیکہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسلام نہ سکون و راحت کی تلاش کی خاطر تھا اور نہ ہی تخفیف عذاب کے لئے تھا بلکہ ان کا اسلام تو دردناک مظالم و جسمانی عذاب کا پیش خیمہ اور ان کی جان کے لئے زبردست خطرہ تھا پھر آخر یہ کس قسم کا عذاب تھا جس کا نہ سلسلہ ختم ہونے کو تھا اور نہ اس میں تخفیف کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔ اس سلسلہ میں بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تمام رفقاء نے مشرکوں کے ہاتھوں بہر حال ہر قسم کے دردناک

عذاب اور روح فرسا مظالم نہایت خندہ پیشانی اور بڑے حوصلہ سے برداشت کیے اور اُف تک نہ کی انہی جانباز مجاہدوں اور سر فروش میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑھاپے کے باوجود موت سے ڈرنے والے شخص نہیں تھے لیکن اسلام قبول کرنے کی پاداش میں ان کو ایسے ہولناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے عذاب کا نشانہ بنایا جاتا تھا کہ وہ چیخ اٹھتے تھے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ جہاد میں شریک رہے حالانکہ ان کی عمر نوے سال سے اوپر تھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں بھی غزوات میں شریک رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے : ''عمار بے شک سراپا ایمان ہیں'' اور آپ نے ان کو مسلمانوں کے لئے اسوہ حسنہ اور نمونہ عمل قرار دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو تاکید فرماتے تھے کہ وہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عمار رضی اللہ عنہم اجمعین کی پیروی کریں اور ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی ایمان کو طلب و تلاش راحت و سکون اور حسن سلوک کی خاطر نہ تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ راحت و آرام کے ساتھ ہر طرح کا مادی فائدہ بھی حضرت معاویہؓ کے ساتھ شریک جنگ رہنے میں ہے لیکن اس کے باوجود وہ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمرکاب رہے تاکہ ان کے جھنڈے کے نیچے موت سے ہمکنار ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فتحیابی کی صورت میں بھی حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر دولت نثار نہ کر دیتے اور نہ ہی ان کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ آرام و فراخی حاصل ہو سکتی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تو ان کو صرف آذوقہ حیات کی ہی امید ہو سکتی تھی۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق یہ قول صادق آتا ہے کہ ان کو نہایت اعلیٰ اور مفید ترین دولت ایمان نصیب ہوئی تھی کیونکہ ان کا ایمان دراصل ایسا زر خالص تھا جس میں ایمان کی محبت کے سوا کسی دنیوی لالچ یا اخروی جزا کی قطعاً آمیزش نہ تھی وہ ایمان برائے ایمان کی مجسم تصویر تھے اور مومن صادق کی پہچان یہ ہے کہ وہ نہ عقیدہ کے بغیر زندگی گزارنے پر راضی ہوتا ہے اور نہ ہی اپنے عقیدہ کے برخلاف ماحول میں زندگی کو قابل قبول سمجھتا ہے چنانچہ وہ موت کو ایسی زندگی پر ترجیح دیتا ہے جو اس کے معتقدات سے مطابقت

نہیں رکھتی اور نہ ہی وہ جنت کی طلب میں موت کی تمنا کرتا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں مادی زندگی اور مادیات پر یقین رکھنے والے لوگوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو اپنے خیالات اور معتقدات کی خاطر جان دے دیتے ہیں حالانکہ ان کو موجودہ مادی زندگی کے بعد کسی دوسری زندگی کی کوئی امید نہیں ہوتی اور جنت ہر اس شخص کو محبوب ہوتی ہے جو اس پر یقین رکھتا ہے پس اس شخص میں جو جہاد کرتا ہے اور اس شخص میں جو جہاد نہیں کرتا ہے اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوتا کہ ایک جنت کو بُرا سمجھتا ہے اور دوسرا اسے محبوب رکھتا ہے ان دونوں میں جو کچھ فرق ہے وہ ایمان کی قوت یا عقیدہ کا ہے اور یہ قوت ایمانی حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں اتنی زیادہ تھی جتنی کسی انسان میں ممکنہ حد تک ہو سکتی ہے اس کے باوجود حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نفس پر موت بڑی آسان رہی ان کو موت سے ملاقات کے دس بار مواقع ملے اور اگرچہ وہ نوے سال سے زائد عمر میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں عمر بھر شریک رہے لیکن موت ان کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علم کے نیچے معرکہ صفین میں آئی تھی مگر وہ دردناک اور روح فرسا عذاب جس کا سابقہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک مدت تک پڑتا رہا اور جسے وہ انتہائی صبر و استقلال اور عزم و استقامت سے برداشت کرتے رہے انہیں برداشت کرنا حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے لئے دوبھر ہو گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ احرار کی بہ نسبت غلاموں نے دین جدید کو قبول کرنے میں زیادہ عجلت اور مستعدی دکھائی لیکن اس سے جو بات سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ غلاموں کو دعوت جدید کی طرف مائل کرنے میں مصلحت کا کوئی دخل نہیں تھا البتہ بعض احرار کے سامنے بعض ایسی مصلحتیں موجود تھیں جو ان کو اسلام قبول کرنے اور اس کی تصدیق کرنے کے علاوہ ایام جاہلیت کے عقائد کو باطل اور لغو سمجھنے سے باز رکھتی تھیں بہرحال یہ کہنے میں کہ کوئی مصلحت دین کو سمجھنے اور اس کو قبول کرنے میں حائل نہیں تھی اور یہ کہنے میں بڑا زبردست فرق ہے کہ دین ہی دراصل مسلمانوں کے لئے مصلحت کے مترادف تھا۔ اس لئے کہ اگر عقیدہ سے مصلحت مراد ہو تو عقیدہ کا وجود دنیا سے ناپید ہو جائے گا حالانکہ مصالح کا وجود تو دنیا میں عقیدہ کے بغیر بھی پایا جاتا ہے چونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے دل میں محبت اور جذبہ اخلاص بدرجہ اتم موجود تھا اس لئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کو محبت و اخلاص کا پیکر سمجھ کر ان کی فوری تصدیق کی اور

چونکہ ان کو رسول خدا ﷺ کی ذات گرامی پر شعوری طور پر مکمل اطمینان واعتماد تھا اس لیے ان کو آپؐ کے قول وفعل سے قلبی سکون واطمینان حاصل ہونے کے ساتھ آپؐ کی عملی تقلید سے بھی بے پایاں مسرت ہوتی تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ایک بار ایک شخص کو یہ اعلان کرتے ہوئے سنا کہ پوری قوم امت واحدہ ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں یہ منادی کرنے والا شخص نہ صرف بنی ہاشم میں بلکہ تمام قبائل عرب میں عزت ومرتبہ کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ مقام پر تھا بس یہی ایک وجہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا ایمان لانے اور اسلام کو دل سے قبول کرنے کی تھی اسلام کی یہ دعوت جو ایک ایسے صاحب حسب ونسب اور گرامی قدر ہستی کی طرف سے دی جارہی تھی جس کے سامنے اپنا کوئی ذاتی مقصد نہ تھا، عقیدہ کی سچائی اور اسلام کی حقانیت کی اساس وبنیاد تھی اسی حقانیت واخلاص سے متاثر ہوکر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اسلام کی طرف اس قدر جلد مائل ہوگئے چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ کی تعلیم ودعوت پر وہ صدق دل سے ایمان لے آئے تو اب ان کے سامنے معاملات میں موازنہ کرنے، کمی بیشی یا نفع نقصان کا حساب لگانے کا مسئلہ باقی نہیں رہ گیا تھا بلکہ اب تو ان کے سامنے اصل مسئلہ ایمان سے لذت وسکون اور قلبی طمانیت وراحت حاصل کرنے کا تھا چنانچہ جب ان کو ایمان کی دولت سرمدی حاصل ہوگئی اور اس کی حلاوت ان کے رگ وریشہ میں سرایت کرگئی تو اسلام وایمان کی راہ میں ہر مصیبت ان کے لئے راحت بن گئی اور مشکل آسان ہوگئی حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنے عقیدہ سے بے پناہ لگاؤ، اسلام سے خلوص اور نبی کریم ﷺ سے محبت کی بنا پر تمام صحابہ میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بلکہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں بھی لوگ ان کو جلیل القدر صحابہ کے برابر سمجھتے تھے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بارہ میں کہا کرتے تھے "ابوبکر ہمارے آقا وسردار ہیں اور انہوں نے ہی ہمارے آقا کو آزاد کرایا ہے۔" اور اس معزز لقب سے ان کی مراد حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہوا کرتے تھے، ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ ابوسفیان بن حرب اور سہیل بن عمرو بن حارث اور کچھ دوسرے عرب سرداروں نے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرنا چاہی اور ان کے ساتھ حضرت بلالؓ اور حضرت صہیبؓ نے بھی حضرت عمرؓ سے ملنے کی خواہش کی، آپ نے ان موخر الذکر دونوں

لوگوں کو ملاقات کے لئے اندر بلا لیا تاکہ پہلے ان کی بات سن لیں اور بعد کو اطمینان سے عرب سرداروں سے ملاقات کریں اس پر ابو سفیان کو سخت صدمہ پہنچا اور وہ نہایت برہم ہوا اور اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا آج جیسا دن کبھی ہم پر نہیں گزرا۔ عمرؓ نے ان لوگوں کو تو اجازت دے دی اور اندر بلا لیا اور ہم کو دروازہ پر ہی کھڑا رکھا اس پر سہیل جو زیادہ بردبار اور انصاف پسند شخص تھے بولے ۔

"اے میری قوم کے لوگو قسم ہے اللہ کی...... آج اگر تم کو غصہ نکالنا ہے تو اپنی جان پر نکالو۔ پوری قوم کو اسلام کی دعوت دی گئی اور ساتھ میں تم کو بھی اسلام کا پیغام پہنچایا گیا اور اسلام لانے کی دعوت دی گئی انہوں نے سبقت کی اور جلدی دکھائی اور تم نے دیر لگائی اس دن کیا ہوگا جب قیامت کے دن وہ بلائے جائیں گے اور تم نظر انداز کر دیئے جاؤ گے۔"

دین جدید کے ادب و شا -اور اعلیٰ تربیت نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے لئے موت کو آسان اور مشرکین کی المناک بد سلوکیوں اور ہولناک اذیتوں کو حقیر شے بنا دیا تھا اور یہی وہ چیز ہے جو انسانی نفس میں عقیدہ کی روح پھونک کر اس کو منفعتوں اور مصلحتوں سے مافوق و بالاتر بنا دیتی ہے یہ نبی اکرم ﷺ کی تعلیم و تربیت اور ادب ہی تھا جو احرار کو بھی نہایت محبوب تھا اور اسی لئے وہ اس کی تصدیق کی طرف متوجہ ہو گئے اور عقیدہ کا مرحلہ اسوقت تمام کو پہنچ گیا جب اسکی محبت و رغبت اور تصدیق پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ مختصر یہ کہ تمام انسان قیامت تک اس نہج پر فکر و عمل کی منزلیں طے کرتے رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں وہ لمحہ بڑا نازک ہوتا ہے جب اس کو کسی چیز پر ایمان لانے اور اس کے داعی کی تصدیق کرنی پڑتی ہے اور جب یہ معاملہ اپنے آخری حد کو پہنچتا ہے تو انسان کے سامنے اس سے نجات پانے کی صرف تین صورتیں ہیں یا موت کو خوش آمدید کہا جائے یا جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے پر قناعت کی جائے یا ایمان کی دولت سرمدی حاصل کی جائے خواہ وہ کہیں بھی ملے۔

حضرت بلالؓ کے اوصاف واخلاق

حضرت بلال رضی اللہ عنہ، متوازن الطبع اور مساوی الفطرت انسان تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنے ہم جنس قوی الطبع بھائی بندوں کی طرح حوادثات و مصائب سے بلا خوف و خطر گزر جاتے تھے افریقی غلاموں کی صفات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ وہ اپنے بد خواہوں اور دشمنوں سے برائیوں کا بدلہ لے لیتے تھے اور جو کوئی ان سے حسن سلوک کرتا تھا اس کے احسان کو بھی عمر بھر نہیں بھولتے تھے اور دونوں طبقوں کے ساتھ ہر دو قسم کے اوصاف کا مظاہرہ اور رد عمل کا اظہار کرتے تھے حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی اپنی مجمل صفات اور اقدار سیرت میں اپنے ہم جنسوں کی طرح ہی تھے اور ابنائے قوم اور اپنے بھائی بندوں کے جن اوصاف و اخلاق سے متصف تھے ان میں امانت و دیانت اطاعت و محبت اور صدق و صفا کے اوصاف شامل ہیں لیکن اسی کے ساتھ دشمنی اور سخت دلی کے موقعوں پر ان میں دشمنی اور قساوت قلبی کے آثار بھی پائے جاتے تھے مگر وہ قساوت قلبی اور عناد کا مظاہرہ کرنے میں کبھی پہل نہیں کرتے تھے اور ان کی قساوت یا سخت دلی کسی وجہ یا سبب کے بغیر نہیں ہوتی تھی اور وہ عناد میں بھی حق و صداقت ایمان اور فکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔

ابن رومی کے اشعار ان کی سیرت کی عکاسی کے لئے کافی ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے :۔

"جب زمین نے تمہارے ڈالے ہوئے بیج کا ثمرہ پیداوار کی صورت میں تمہیں ادا کر دیا تو تمہارے لئے یہ کافی ہے۔ اور اگر اس طرح قرض وصول ہو جائے تو برا کیا ہے، بُرائی کی بات یہ ہے کہ تم مقروض ہو اور کسی کا قرض اتار بھی نہ سکو۔"

چنانچہ جن لوگوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ برائی کی وہ ان میں برائی

کے اثرات کی تعریف نہیں کر سکتے تھے مگر ایسے لوگ بالعموم ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے بھی خواہاں رہتے تھے حالانکہ وہ خود ان کے ساتھ برائی کرنے میں پہل کر چکے تھے اور جب یہ لوگ ان کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے تھے تو پھر ان کی عیب چینی اور برائی بیان کرنے میں لگ جاتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ جب ایک خریدار ان کے آقا کے مقابلہ میں ان کی خریداری کے لئے مقابلہ میں آگیا۔ اس پر ان کے آقا نے متعجب ہو کر کہا تم اس کو خرید کر کیا کرو گے یہ تو بڑا خبیث انسان ہے حتیٰ کہ ان کے غصہ اور خفگی کو بھی اس کی بد معاملگی اور سوء معاشرت پر محمول کیا۔ بہر حال ان چیزوں کے باوجود سب لوگ حضرت بلال رضی اللہ عنہ، کی تعریف میں رطب اللسان تھے ان کا کہنا تھا کہ وہ بڑے خوش مزاج اور صادق الایمان شخص تھے اور خبث باطنی، ناشکری اور احسان ناشناسی سے کوسوں دور تھے ان کا چہرہ بشرہ اگرچہ سیاہ تھا مگر ان کا دل آئینہ کی طرح صاف وشفاف تھا جس میں لوگوں کو اپنے اعمال کے خدوخال نظر آتے تھے ان کی فطرت کا سب سے چمک دار جوہر ان کا جذبہ اطاعت وفرمانبرداری اور اپنے آقا کے ساتھ سچا خلوص و وفاداری تھا اور جس طرح اللہ تعالیٰ پر ان کا ایمان نہایت قوی اور مستحکم تھا اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کو بے حد خلوص اور بے انتہا جذبہ فدائیت تھا وہ رسول اللہ ﷺ کی محبت والفت کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے، اور ان کے اتباع وپیروی کو خدا کی خوشنودی اور آخرت کا توشہ سمجھتے تھے وہ دنیا کی زندگی میں اور موت کے بعد عقبیٰ کی زندگی میں رسول خدا ﷺ کے قرب اور آپؐ کی رضا کے سوا کسی شے کے طلبگار نہ تھے، جب ان کی موت کا وقت قریب آیا اور ان پر نزع کی حالت طاری ہو گئی تو ان کی بیوی آہ وبکا کرنے لگیں اور "واحزنا" "ہائے کیسا غم ہے" کہہ کر چیخنے لگیں تو سکرات موت کے عالم میں ان کی زبان پر یہ کلمات جاری ہو گئے۔ بل وافرحتاه انلقي الاحبه غداً نلقي الاحبه، محمداً وصحبه (نہیں بلکہ یہ تو خوشی کا مقام ہے کل کو میری اپنے دوستوں سے ملاقات ہو گی، کل تو اپنے پیاروں سے ملاقات کا دن ہے محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں سے۔)

بہر کیف یہ تھا ان کی دنیاوی زندگی اور موت کا انداز، اس بھری پری کائنات میں ان کا اگر کسی سے کوئی رابطہ یا تعلق تھا تو اول و آخر صرف اپنے ہادی برحق اپنے آقا و مولیٰ محمد ﷺ سے تھا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وفادار اور اطاعت شعار بیوی عام طور پر اہم امور میں

ان کی دلجوئی اور خوشنودی کو اپنا مقصد حیات سمجھتی تھیں لیکن کبھی کبھار بعض مواقع پر آپس میں تلخی اور جھگڑے کی نوبت بھی آجاتی تھی جیسا کہ بعض میاں بیوی یا عام انسانوں کے مابین معاشرتی امور میں ناخوش گوار حالات پیش آجاتے ہیں۔ بہرحال حضرت بلال رضی اللہ عنہ، گرم و سرد حالات میں بھی اپنی بیوی کے ساتھ اچھی طرح گذر بسر کر رہے تھے البتہ کسی ایسی اصولی و بنیادی بات میں جس سے ان کی زندگی کا براہ راست اور گہرا تعلق ہوتا رخنہ پیدا ہوتا تو ان کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا تھا مثلاً رسول اللہ ﷺ سے ان کے خلوص اور صدق روایت کے متعلق کسی طرف سے شبہ کا اظہار ان کے لئے سب سے بڑا سوہان روح اور تکلیف دہ ہوتا تھا ایک روز ایک حدیث حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کے سامنے بیان کی جس کو انہوں نے بڑا عجیب اور حیرت انگیز سا جانا اس پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ سخت طیش میں آگئے، غیظ و غضب میں آکر ان کو پکڑ لینا چاہتے تھے اور جب غصہ میں آپے سے باہر ہو گئے تو اپنا مکان چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے راستہ میں اچانک رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ ان کے تیور او غصہ سے بھرے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر حالات کو پوری طرح سمجھ گئے آپؐ نے سمجھا بجھا کر اول تو ان کا غصہ ٹھنڈا کیا اور پھر شفق و محبت سے ان کو دلاسا دیا اور بیوی کی طرف سے صدق روایت سے متعلق بدگمانی کو بھی نظر انداز کر دینے پر آمادہ کر لیا اور ان کو ساتھ لے کر آپؐ ان کے گھر تشریف لے گئے اور آپؐ نے ان کی بیوی سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا، جو کچھ تم سے بلالؓ نے مجھ سے منسوب کر کے بیان کیا ہے وہ سچ ہے بلال کبھی جھوٹ نہیں بولتے ہیں، تم بلالؓ پر غصہ نہ کیا کرو۔ یہ سن کر حضرت بلالؓ کو قرار آگیا اور ان کا غصہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے مذکورہ کلمات سن کر بالکل رفعہ ہو گیا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اس صدق کا اثر صحابہ کرام علیہم اجمعین پر بھی بہت ہوا ایک دفعہ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کی ہوئی چیز پر شک کر سکتے تھے لیکن حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی کسی روایت کے نقل و بیان میں قطعاً شبہ نہیں کرتے تھے اور نماز اور روزہ کے بارہ میں تو خصوصیت سے ان کی روایتوں کا یقین کرتے تھے، عرب کے صحراء میں جہاں سورج غروب ہونے کے بعد بھی دن سا پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور سورج نکلنے سے پہلے ہی روشنی پھیلنی شروع ہو جاتی ہے بعض مسلمانوں کو سحر و افطار کے اوقات کے متعلق تردد رہتا

تھا چنانچہ وہ کہتے تھے ہم نے دیکھا ہے کہ فجر نمودار ہو چکی ہے کبھی کہتے تھے ہم نے سورج کو کلیتاً غروب ہوتے نہیں دیکھا، لیکن جب وہ حضرت بلالؓ کو یہ کہتے ہوئے سنتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھانا کھالیا ہے یا رسول اللہ ﷺ نے سحری کھانا ترک کر دی ہے، تو وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قول کو جھٹلاتے نہ تھے اور ان میں سے کسی کے لئے بھی دن کی روشنی کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو سچائی اور راست گوئی کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ وہ ہر اس کلام یا پیغام کو جو وہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے مسلمانوں کو پہنچاتے تھے یا کوئی بھی خاص یا عام بات مسلمانوں کے معاملات کے بارہ میں کہتے تھے تو اس میں صداقت اور راستی کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ چنانچہ جب ان کے دینی بھائی ابورویحہ نے ان سے اہل یمن کے ایک قبیلہ میں اپنی شادی کی سعی وسفارش کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے اس کے سوا کچھ نہ کہا کہ میں بلال بن رباح ہوں اور یہ میرا بھائی ابورویحہ ہے جو خلق ودین کے اعتبار سے بڑا آدمی ہے اگر تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو تو کر دو اور اگر اس کو پسند نہیں کرتے تو جانے دو ان لوگوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی زبانی صاف اور دوٹوک بات سن کر کچھ نہ کہا اور خاموشی سے شادی کرنے پر راضی ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بے لاگ طریقہ پر جو کچھ کہا اس میں نہ کوئی مبالغہ آرائی کی تھی اور نہ ہی ابورویحہ کی سفارش میں کسی ملمع سازی سے کام لیا تھا چنانچہ اسی صاف گوئی کی بدولت اہل یمن نے ابورویحہ سے اپنے قبیلہ کی لڑکی کی شادی کر دی۔ ابورویحہ کے لئے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی محبت اور دوستی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ شام کی طرف کوچ کرنے لگے تو انہوں نے اپنا نام ابورویحہ کے ساتھ درج رجسٹر کرایا اور جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے ناموں کے اندراج کا رجسٹر تیار کرایا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ وہ کس کے ساتھ اپنا نام درج کرانا چاہتے ہیں تو انہوں نے ابورویحہ کے ساتھ شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی اور کہا تھا اس دینی اخوت کی وجہ سے جو رسول اللہ ﷺ نے میرے اور ابورویحہ کے درمیان قائم کر دی ہے میں کبھی ان سے جدا ہونا گوارا نہیں کروں گا۔ اور اس کی اصلیت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا دینی بھائی بنا دیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی حضرت بلال رضی

اللہ عنہ سے قربت و محبت کو بہت اہمیت دیتے تھے اور اس کو اپنے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے لئے رسول اللہ ﷺ کا فضل و انعام تصور کرکے دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بطور خاص حضرت بلالؓ کو نوازتے رہتے تھے اوران کی دلجوئی کا خاص خیال رکھتے تھے، رسول اللہ ﷺ جو مسلمانوں کے عظیم ہادی اور جلیل القدر رہنما تھے وہ جلیل القدر اور ہوش مند مسلمانوں کے فضائل و مناقب سے اچھی طرح واقف تھے اور وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی دیانت وامانت اور راستی و صداقت کے اوصاف سے بھی پوری طرح باخبر تھے اسی لئے آپؐ نے ان کو اپنا معتمد خاص بتایا، مسلمانوں کے مال پر ان کو امین مقرر کیا اور اپنے طعام و قیام اور خوراک وغیرہ کے اہتمام وانتظام کا کام بھی ان کے سپرد کیا۔ رسول اللہ ﷺ ان کو نہ صرف غزوات میں بلکہ سفر و حضر میں بھی ان کو اپنے ہمراہ رکھتے تھے اور عید و استسقاء کے موقعوں پر تو نیزہ برداری کا منصب بھی ان کے ہی حوالہ تھا جس کو لے کر وہ ایسے تمام اہم موقعوں پر حضور اکرم ﷺ کے آگے آگے چلتے تھے صحابہ کرام میں سے کسی دیگر شخص کو یہ شرف حاصل نہ تھا جو موذن رسول علیہ السلام کو حاصل تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اکثر و بیشتر حضور کی قصویٰ نامی اونٹنی پر بیٹھ کر جس کو کوئی دوسرا شخص استعمال نہیں کر سکتا تھا سفر کے دوران حضور ﷺ کے قیام وطعام کے لئے بطور ہراول پیشقدمی کرنا پڑتی تھی فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جن تین بزرگوں کو سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہوا ان میں پہلے شخص عثمان بن طلحہؓ حامل کلید کعبہ تھے دوسرے اسامہ بن زیدؓ اور تیسرے خود حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی رفاقت و معیت حضور ﷺ کی تکفین و تدفین تک قائم رہی اور یہ حضرت بلالؓ ہی تھے جو اس آخری وقت میں بھی اپنے زخمی اور درد بھرے دل اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے مناقب و فضائل پُر درد طریقہ پر ذکر کرتے ہوئے اور ہاتھ میں پانی کا مشکیزہ لئے آپؐ کی مقدس قبر اور اس کے چاروں طرف گھوم گھوم کر پانی چھڑکتے جارہے تھے۔

اپنے آقا و مولی محمد عربی ﷺ کے لئے اس قدر دلسوزی ورقت رکھنے والے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے دل میں اپنی رائے پر اصرار کی کیفیت بھی بڑے شد و مد سے پائی جاتی تھی اور اس کی وجہ عقیدہ توحید اور اسلامی فضائل اخلاق پر ان کا غیر متزلزل ایمان اور رذائل

سے نفرت تھی۔ اور بسا اوقات اس شدید اصرار میں اس عناد اور ضد کی رمق بھی پائی جاتی تھی جو حبشہ کے مولدین اور اصل حبشی النسل لوگوں میں ہمیشہ سے پائی جاتی تھیں جس میں ایک جہت یا پہلو قابل تعریف اور مفید تھا اور دوسری جہت یا پہلو قابل مذمت اور مضر تھا عناد کا ایک پہلو صواب و راستی اور عقیدہ پر ثبات و استقلال کا ہے اور دوسرا پہلو خطا اور خواہش نفس پر جمے رہنے کا ہے لیکن ہمیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے تاریخی عناد پر دونوں پہلوؤں کے خوبصورت جلوے اور حسین ترین امتزاج ملتا ہے اور ان دونوں میں اسیروں کی سی قوت برداشت اور امینوں کے سے اخلاقی فضائل کی سی جھلک نظر آتی ہے۔ مشرکین کے لئے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عناد پر اصرار ان ہولناک مظالم اور دردناک عذاب کے باعث تھا جو مشرکین ان کو دین جدید سے بیزار و برگشتہ کرنے اور خود ان کے باپ کو ان کی زبان سے گالیاں دلوانے کے لئے ان پر روا رکھتے تھے جن کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں ان کے اسلام لانے کے سلسلہ میں کر چکے ہیں ان کی اس طبعی خصلت کا نتیجہ ترک اذان کی صورت میں ظاہر ہوا جب کہ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ان کا اذان دینا شرط وفاداری اور استواری عہد کے خلاف ہے اسی لئے وہ بسا اوقات مدینہ چھوڑ کر سفر جہاد پر جانے کے لئے اصرار کرتے تھے چنانچہ اسی جذبہ کے تحت انہوں نے مدینہ سے شام کی طرف کوچ کر جانے کی خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب کی تھی اور ایک مشہور روایت کے مطابق ان الفاظ میں اپنا پر زور مطالبہ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا تھا۔

"اگر آپ نے مجھے اپنے نفس کے لئے آزاد کرایا ہے تو بیشک مجھے روک لیجئے اور اگر آپ نے اللہ عزوجل کے لئے مجھے آزاد کرایا ہے تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں اللہ عزوجل کی طرف چلا جاؤں" چنانچہ اپنی مرضی کے علاوہ کسی اور طرف جانے سے انہوں نے انکار کر دیا اس میں شبہ نہیں کہ ایک ایسے آدمی سے دشمنوں کے ساتھ رحم و مروت کی توقع رکھنا بالکل فضول ہے جو نہ صرف خود بلکہ اس کے آباؤ اجداد اور ہم جنس ہمیشہ لئیموں اور ظالموں کا شکار رہے ہوں لیکن اگر ایسے مظلوم شخص کے خلق و مروت کے مستحق ایسے لوگ ہوں جنہوں نے مصیبت کے وقت اس کے ساتھ احسان اور ہمدردی کی ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے البتہ تعجب اور حیرت اس وقت ہوتی ہے جب میدان کارزار میں رحم کا مظاہرہ کیا

جائے یا اس شخص کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا جائے جس نے بد سلوکی میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو اس لئے ہمیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی بابت اس روایت میں قطعاً کوئی غرابت محسوس نہیں ہوتی جو قسی القلب اور ظالم مشرکین کے ساتھ بدر اور خیبر کے معرکوں کے بعد ان سے منسوب ہیں چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے قلعہ حموص کو فتح کیا تو آپ کے سامنے قلعہ کے حاکم کی بیٹی صفیہ اور ان کی ایک اور کمسن رشتہ دار کو حاضر کیا گیا، آپ نے ان دونوں کو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگرانی میں اپنے جائے قیام پر بھیج دیا جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ ان دونوں کو لے کر خیبر کے مقتولین کے پاس سے گزرے تو چھوٹی لڑکی اس منظر کو دیکھ کر بے تحاشا چیخ پڑی اس پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اس کے تھپڑ کھینچ مارا اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خود انہوں نے اس واقعہ سے مطلع کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ سے فرمایا "اے بلال جب تم اس کمسن بچی کو لے کر لاشوں کے قریب سے گزرے تو کیا تمہارے دل سے جذبہ رحم بالکل ہی نکل گیا تھا۔" حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں جو عذر پیش کیا وہ یہ تھا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں سمجھتا تھا کہ آپؐ اس کو اتنا بُرا سمجھیں گے میں تو سمجھتا تھا کہ آپ ان کی لاشوں کو پڑا ہوا دیکھ کر خوش ہوں گے" لیکن واقعہ بدر کے متعلق ان کا عذر زیادہ واضح تھا اور واقعہ خیبر سے بھی زیادہ وزنی اور پُر اثر تھا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اُمیہ بن خلف اور اس کے بیٹے کو واقعہ بدر کے بعد حضرت عبدالرحمان بن عوف کے ساتھ جو ان کو قیدیوں کی طرح اپنے ساتھ لے جارہے تھے دیکھا یہ دونوں باپ بیٹے کمزور مسلمانوں کو ستانے اور ایذائیں دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تو ان کے مظالم کا سب سے زیادہ نشانہ بننا پڑا تھا چنانچہ جب ان کی نظر اُمیہ بن خلف پر پڑی تو آس پاس کھڑے ہوئے مسلمانوں کو سناتے ہوئے انہوں نے چیخ کر کہا۔ اُمیہ کفر کا سرچشمہ ہے اگر وہ چھوٹ بھی گیا تو بھی بچ نہیں سکے گا غرضیکہ عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کی حمایت و مدافعت اس کے کچھ کام نہ آئی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس کے قتل کے درپے تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے اگر چھوٹ گیا تو بھی بچ کر نہیں جائے گا۔ یہاں تک کہ ان کے گرد ایک مجمع لگ گیا اتنے میں کسی شخص نے اُمیہ کے بیٹے پر ایک شدید ضرب کا وار کیا جس سے وہ پچھاڑ کھا کر زمین پر گر پڑا اس منظر کو دیکھ کر اُمیہ نے سخت

خوفزدہ ہو کر زبردست چیخ ماری عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ بولے "اُمیہ اپنی جان بچا کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ ورنہ بچ نہیں پاؤ گے۔ قسم خدا کی میں بھی تمہیں بچا نہ سکوں گا۔ لیکن قبل اس کے کہ اسے وہاں سے فرار ہونے کا موقع ملے مقاتلین باپ بیٹے دونوں پر تلواریں سونت کر ٹوٹ پڑے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اُمیہ بن خلف سے انتقام لینے کی بظاہر ایک معقول وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ یہ شخص جہاں اپنے خبث باطنی اور شر پسندی کے باعث سب لوگوں سے زیادہ مسلمانوں کے انتقام اور بے رحمانہ سلوک کا مستحق تھا وہیں کمزور اور بے سہارا مسلمانوں پر بزدل ظالموں کی طرح ظلم وستم کے نت نئے طریقے اور ڈھنگ بھی ایجاد کیا کرتا تھا اور غیور و بہادر دشمن کی طرح کبھی کھل کر سامنے سے وار نہیں کرتا تھا بلکہ مکار اور دھوکا باز نامردوں کی طرح بے بس مسلمانوں کو ستانے اور ان پر مشق ستم کرنے کے نئے طریقے ڈھونڈتا تھا یہ شخص بزدل ہونے کے باعث جدال وقتال سے بہت ڈرتا بھی تھا اور اپنی زندگی کو بہادر مشرکوں کی طرح کبھی جنگ کے خطرات میں نہیں ڈالتا تھا ایک دن اس نے کسی سے سن لیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا ہے یہ سن کر اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے چنانچہ اپنی قتل گاہ کی نشاندہی کے بارہ میں وہ خوف وہراس کی حالت میں لوگوں سے پوچھتا پھرتا تھا اور وہ اپنی قوم سے علانیہ طور پر جنگ سے باز رہنے کی درخواست کرتا تھا اور اپنی موت کے خوف سے مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے لئے کبھی جنگ پر آمادہ نہیں ہوتا تھا چنانچہ جب اس نے جنگ کے خوف سے گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا تو ابو جہل اس کے پاس کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر آیا اور ایک انگیٹھی ہاتھ میں لے کر امیہ کو دھنی دینے کے لئے آگے بڑھا اور کہنے لگا "یہ لے اپنے آپ کو دھنی دے لے کیونکہ تو ایک عورت ہے جب بدر کے میدان میں معرکہ کارزار گرم ہوا تو امیہ بن خلف اور اس کا بیٹا میدان جنگ سے بھاگنے اور فرار ہونے والوں میں پیش پیش تھے اس کے بعد جب اس کا بیٹا قتل ہوا تو امیہ بن خلف نے سخت دہشت زدہ ہو کر چیخ ماری، حقیقت یہ ہے کہ امیہ بن خلف ہمیشہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا کمزور اور بے بس مسلمانوں کے خلاف ذلیل اور غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کرتا تھا اور اس کی بنیاد عقیدہ کا کوئی جھگڑا نہ تھا جس کے لئے بہادر شخص لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس کے لئے وہ خود اور اس کی اولاد عزت کی موت کو خوش آمدید کہتے ہیں ظاہر ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے جذبہ انتقام کی تسکین کے

لئے ان سے بہتر اور خوش آئند ساعتیں اور کیا ہو سکتی تھیں اور ان کی عذر خواہی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امیہ بن خلف کو قتل کرنے کی وعید بھی بہت کافی تھی چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کے قتل کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں مبارکباد دی۔

"مبارک ہو خدائے رحمان تمہارے خیر میں اضافہ کرے اے بلالؓ تم انتقام کی مراد کو پہنچ گئے۔"

ہیجان اور طیش کے مواقع پر عام طور پر بڑے بڑے سنجیدہ اور بردبار لوگ بھی اپنے جذبات پر کم ہی قابو پاتے ہیں ایسے ہی ایک موقع پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی غیرت و حمیت میں جو شدت پیدا ہوئی وہ ان جیسے شخص کے لئے کوئی غیر فطری بات نہیں تھی ورنہ عام حالات میں وہ بڑے متحمل مزاج خلیق خوش طبع اور شریف النفس انسان تھے ایام غلامی میں جب کبھی لوگ ان کے صبر واستقلال اور مردانہ وار مصائب و آلام کو برداشت کرنے کی داستانیں ستائش کے انداز میں بیان کرتے تھے تو وہ اجل صحابہ کے سامنے لوگوں کی زبانی اپنی تعریف سن کر محجوب و شرمندہ ہو جایا کرتے تھے وہ کہا کرتے تھے :۔

بھائیو! میں تو ایک ایسا شخص ہوں جو کل تک غلام تھا ان کی اس انکساری اور کسر نفسی میں لوگوں کو ان کی نفسی شرافت و محبت کی مہک محسوس ہوتی تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ عرصہ دراز تک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت و مصاحبت میں رہے وہ سفر و حضر میں ہمہ وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے ان کے ذریعہ لوگوں کو جو روایات پہنچتی تھیں ان کی صداقت کے باعث ان پر وہ پورا وثوق رکھتے تھے پھر بھی وہ روایت حدیث میں بہت احتیاط برتتے تھے اسی لئے وہ احادیث نبویؐ کو لوگوں میں ذریعہ تعلیم بنانے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اقامت صلوٰۃ و اذان اور اوقات افطار و صوم کے علاوہ انہوں نے کوئی حدیث بیان نہیں کی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی میں دو ایسی خصلتیں پائی جاتی تھیں جو ان کی ہم جنس قوم کے بعض قدیم و جدید افراد میں بالعموم پائی جاتی ہیں ایک فراست نظر دوسرے جب عیش و آرام کے باوجود عسرت و تنگی، ایک مرتبہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غیر مسلم شخص تمیمی کے ہمراہ روانہ کیا تاکہ وہ مذکورہ شخص کے لڑکے کو مسلمانوں کی قید سے رہائی دلا دیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ سایہ کی طرح ہر

وقت ساتھ ساتھ لگے رہتے انہوں نے دونوں میں سے کسی کو بھی ایک دوسرے کی طرف راغب ومائل ہوتے نہیں دیکھااور جب اس کا تذکرہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپؐ نے فرمایا یہ کوئی نئی بات نہیں ہے "عرب بدوؤں کی یہ خصلت ہوتی ہے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ خیبر کے بعد جب وادی قریٰ کی طرف روانہ ہونے کا ارادہ کیا تو آپؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ انہیں صبح کی نماز کے لئے بروقت جگا دیں، اس وقت چونکہ سخت گرمی تھی اس لئے آپؐ کی آنکھ لگ گئی یہاں تک سورج طلوع ہو گیا۔ آپؐ بیدار ہوئے اور جو جو آپؐ کے ہمراہ تھے ان کے ساتھ نماز ادا کی اس دن شدید گرمی کے باعث ایک شخص کی پیشانی سے پسینہ کی لڑیاں بہہ رہی تھیں جب آپؐ نے سلام پھیرا تو فرمایا ہمارے نفوس اللہ تعالیٰ کے قبضہ وقدرت میں ہیں اگر وہ چاہتا تو قبض کر لیتا اور اسی کے قبضہ میں سب کچھ ہے اور پھر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف مخاطب ہوئے اور انہیں بآواز بلند پکارا اور فرمایا بلال ذرا ٹھہرو صبر سے کام لو۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرمؐ کے ارشاد کا مطلب سمجھ گئے فرمانے لگے: "آپ پر میرے ماں باپ قربان میری جان بھی اسی کے قبضہ میں ہے جس کے قبضہ میں آپ کی جان ہے۔" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آخری عمل جو حضرت خالد بن ولیدؓ کے سلسلہ میں پیش آیا یہ تھا کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں ان تحائف وہدایا کے متعلق پوچھ گچھ شروع ہوئی جو شعراء کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دیا کرتے تھے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کیا یہ چیزیں سرکاری خزانہ سے دی گئی تھیں یا خود ان کی طرف سے شعراء کو عطا ہوئی تھیں اس سوال کا جواب چونکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دینا نہیں چاہتے تھے اس لئے خاموش رہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ ان کی اس خاموشی کو برداشت نہ کر سکے اور ان کی طرف جھپٹ پڑے اور ان کا عمامہ اپنے ہاتھ میں لیا اس کو پھاڑا اور اس سے ان کو باندھ دیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس پر کوئی مزاحمت نہیں کی، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے دریافت کرنا شروع کیا یہ سب کچھ تمہارے پیسوں کا خریدا ہوا تھا یا دوسرے ذرائع سے دیا گیا ہے اس پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا نہیں بلکہ سب کچھ

میرے پیسہ کا تھا۔ اس پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ان کی گلو خلاصی کی اور ان کے سر پر اپنے ہاتھ سے پگڑی باندھی اور پھر فرمایا:

ہم تو اپنے حاکموں کا حکم سن کر اس کی تعمیل کرتے اور ان کا حکم بجالاتے ہیں ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور ان کی خدمت بجالاتے ہیں تاہم یہ ہے وہ آخری عمل جو عہد خلافت کے دوران احکام بجالانے کے سلسلہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے منسوب اور مروی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے تمام اعمال و وظائف کا خلاصہ اگر ہم بیان کرنا چاہیں تو وہ جذبہ اطاعت و تعظیم ہے۔ خلیفۃ الاسلام کے حکم کی بجا آوری میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا محاسبہ کرتے وقت جس اخلاقی جرات و سرعت کا مظاہرہ کیا اس سے زیادہ فرحت و راحت کا اظہار انہوں نے اس وقت کیا جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ محاسبہ سے پاک اور بری قرار دیے گئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنے حاکم مطاع کی اطاعت و فرماں برداری صرف قابل اطاعت امر میں ہی کیا کرتے تھے او یہ اطاعت بھی قوی اور شریف کی ہوتی تھی نہ کہ کمینہ و کمزور اور مجبور محض کی وہ اپنے ظالم آقا کے حکم کو اس وقت بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے تھے، جب موت کی تلوار ان کے سر پر لٹکتی رہتی تھی اور اس وقت بھی وہ اپنے ضمیر کی اطاعت کو فرض کا درجہ دیتے تھے جب سرکش و ظالم اور گنہ گار لوگ ان کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دیتے تھے اس لئے وہ صحیح معنی میں مطیعوں اور فرماں برداروں کے سردار کہلانے کے قابل تھے حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو اس وقت تک دنیا میں عزت نہیں ملتی جب تک وہ سید الامرین نہ ہو اور سید الامرین ہونے کے لئے سید المطیعین ہونا اولین شرط ہے۔

اذان

دنیا کی دعوتوں میں سب سے اعلیٰ اور افضل دعوت وہ ہے جس کے ذریعہ لوگوں کو نماز کے لئے بلایا جاتا ہے یہ ایسی دعوت ہے جو خود نماز کے مرکز و بطن سے پیدا ہوتی ہے اور اس وقت یہ دعوت اسرار و عجائبات میں لپٹی ہوئی غیبی آواز کے ساتھ فضا میں بلند ہوتی چلی جاتی ہے یہ دعوت زندۂ جاوید ہے جس کی آواز بازگشت اس عالم ناسوت میں ہر چہار طرف سے ہمارے کانوں میں رس گھولتی ہوئی آرہی ہے اور ہمیں مخاطب کر رہی ہے گویا انسان اس دعوت کے بول کان میں پڑتے ہی نماز میں مشغول ہو جاتا ہے اور اس کو سنتے ہی اس جہان آب و گل اور عالم اجساد سے نکل کر عالم غیب میں جا پہنچتا ہے اس دعوت سے آسمان اور زمین میں ملاپ ہوتا ہے اور اس دعوت میں مخلوق کا خشوع و خضوع خالق کی عظمت و کبریائی سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ یہ دعوت ہر نماز کے وقت حقیقت ابدی بن کر انسانی قلوب پر جلوہ ریز ہوتی رہتی ہے۔ گویا کہ یہ کوئی نئی چیز ہے اللہ اکبر، اللہ اکبر اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔

یہ اذان کی دعوت کے ابتدائی بول ہیں جن کے ذریعہ مسلمانوں کو خدا کے حضور سجدہ ریز ہونے یعنی نماز پڑھنے کے لئے بلایا جاتا ہے یہی وہ زندہ و پائندہ دعوت ہے جو دائمی اور ابدی حقیقت کا مظہر ہے اور یہی وہ حقیقت کبریٰ ہے جو انتہائی بسیط ہونے کے ساتھ بے حد عجیب بھی ہے اس لئے کہ یہ حقیقت نہ صرف دنیا کی تمام حقیقتوں سے بے نیاز کر دینے والی ہے بلکہ دنیا کے مشاغل اور عوارضات فنا کے تکرار سے بھی بے انتہا غنی کر دینے والی ہے۔ مسلمان جب اذان کی آواز سنتا ہے تو اس کی رغبت نماز کی طرف اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ اس کے دل میں عظمت و جبروت الٰہی کا نقش اور یاد تازہ ہوتی ہے جو تمام

عبادات کا خلاصہ ہے اذان سے رات کا سناٹا دُور ہو جاتا اور خاموشی ٹوٹ جاتی ہے، اس سے روح میں بالیدگی اور طبیعت میں جولانی پیدا ہوتی ہے تمام چرند پرند اور انسان و حیوان اس سرمدی آواز کے ساتھ ہوشیار و بیدار ہونا شروع ہو جاتے ہیں اس سے نسیم سحری جنم لیتی ہے اور اسی سے پانی کی مدھم رفتار اور آہستہ خرامی کا آغاز بھی ہوتا ہے اور جب موذن صبح کی اذان کے بول الصلوۃ خیر من النوم نماز نیند سے بہتر ہے، کہنا شروع کرتا ہے تو ساری دنیا اس آواز پر لبیک اور آمین کہنے کے لئے خواب راحت سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے غرضیکہ چند لمحوں ہی میں زندگی کی چہل پہل از سر نو شروع ہو جاتی ہے اور ہر ذی روح میں حس و حرکت کے آثار نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ہر شے زبان حال سے پکار اٹھتی ہے کہ کوئی خفیہ ہاتھ سب کو خشوع و خضوع اور تسبیح و صلوۃ کے لئے بیدار کر رہا ہے اور الصلوۃ خیر من النوم کے ترانے سنوار رہا ہے اور جب صبح کی روشنی شب کی تاریکی کو الوداع کہتی ہے اور اندھیری رات کے اسرار ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے ہیں تو اذان سحر کے اثر سے ہر چہار طرف سے صدائے بازگشت گونجتی سنائی دیتی ہے گویا اذان ایک ترجمان کی حیثیت سے زندوں کو پکار پکار کر جگاتی ہے اور فضائے آسمانی میں عظمت الٰہی کے ڈنکے بجاتی ہے جس طرح اذان کی شکل میں حمد باری کے ترانے جہان شب کی خاموش فضاؤں میں گونجتے ہیں دن کے پر شور ہنگاموں میں بھی اس کی صدائیں وقفہ وقفہ سے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں جہاں شب کی اذان سے نفس کو راحت اور دل کو سکون و طمانیت کی لازوال دولت نصیب ہوتی ہے دن کی اذان انسان کو سعی پیہم اور مسلسل جدو جہد کا پیغام دیتی ہے اذان شب کے وقت اجسام انسانی کو بیدار رکھتی اور دن رات ارواح کو ہوشیار رکھتی ہے، وہ دن کے شور و ہنگامہ میں سکون و طمانیت کا پیغام لاتی ہے اور جب انسان دنیوی مشاغل اور مادی خواہشات کی تکمیل میں الجھا ہوا ہوتا ہے تو اذان اسے حی علی الصلوۃ۔ نماز کے لئے آؤ، حی علی الفلاح۔ فلاح کے لئے آؤ۔ کا مژدہ جانفزا سناتی ہے، بیشک یہی فلاح حقیقی فلاح ہے کیونکہ ایمان کی دولت کے بغیر ہر قسم کی فلاح سراسر خسارہ ہے جس طرح اذان اپنے وجود کے لئے کسی شے کی منت پذیر نہیں ہوتی اسی طرح اذان عقیدہ و ایمان اور اتباع سنت کے بغیر بھی ظہور پذیر نہیں ہوتی ہم ایام طفولیت میں بھی اگرچہ اذان سنتے ہیں لیکن عہد طفولیت میں اس کے پورے مفہوم اور معنویت سے قطعاً ناآشنا رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اذان کی پکار اور

آواز ہیں اور اپنے چاروں طرف دنیا میں بلند ہونے والے لہو ولعب شور و شغب اور بازاروں کے ہنگامہ پرور اور بے معنی چیخ و پکار میں تمیز ضرور کر لیتے ہیں ہم اذان سنتے ہی اس کی گرفت میں آجاتے ہیں لیکن اس عمر میں ہم یہ نہیں سمجھ پاتے کہ ہم کیوں اور کس لئے اس کی گرفت میں آگئے ہیں بہر حال ہم یہ چاہتے ہیں کہ کاش ہم اس کی طرف سبقت کریں، اس کی طرف لپکیں اور اس پکار کا جواب دیں، ہمارے مفسرین ہمارے لئے امر الٰہی کی تشریح کرتے ہیں تو کلمتہ الامر اور کلمتہ اللہ کا مطلب بھی سمجھ لیتے ہیں لیکن بقیہ امور کے لئے حیرانی میں پڑ جاتے ہیں اور اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں شعور کی پختگی تک زمانہ مستقبل پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور پھر زمانہ مستقبل کے بعد بھی برسہا برس گزر جاتے ہیں اور ہم ہنوز عہد طفولیت کی حیرانی سے یہ تسکین حاصل کر لیتے ہیں کہ ہم ہمیشہ اسی طرح حیرانی سے دوچار رہے ہیں اگرچہ اس حیرت کے نام بھی بار بار تبدیل ہوتے رہے ہیں اور ایک عنوان کے بعد اسے دوسرا عنوان بھی دیا جاتا رہا۔ بچپن کی سنی ہوئی یہ صدائیں نفس میں مدت دراز سے متمکن رہتی ہیں اور انسان ہوش مند ہونے کے بعد آہستہ آہستہ اس کی طرف دھیان دینے پر مجبور ہو جاتا ہے گویا وہ اب اذان کی سماعت کے مرحلہ سے گزر کر ایسے مرحلہ میں داخل ہو گیا ہے جہاں سے اذان کی حکمت و مصلحت کے چشمے پھوٹنا شروع ہو جاتے ہیں اور اس کی روح کو ہر دم بے چین کیے رہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان اپنے بچپن کے لاشعوری دور سے آہستہ آہستہ نکل کر شعور ایمانی کے دور میں داخل ہوتا جاتا ہے۔ لیکن غریب الدیار اور عقیدہ اسلام سے خارج لوگوں کا معاملہ قدرے اس سے مختلف ہے۔ اسلامی عبادات کے تمام دیگر شعائر عام طور پر غیر مسلموں کو اتنا زیادہ اپنی طرف نہیں کھینچتے اور اتنا متاثر نہیں کرتے جتنا کہ اذان کے بلند و بالا میناروں سے ترتیل کے ساتھ گونجتی ہوئی اذان کی ترنم ریز صدائیں ان کو متاثر کرتی ہیں۔ خواہ اس ترنم و ترتیل میں مؤذنوں میں کتنا ہی بعد و فرق کیوں نہ ہو، ایڈورڈ ولیم لین اپنی کتاب "محدثین کے احوال و عادات" میں لکھتے ہیں۔ "اور ان کی آواز یقیناً بڑی مسحور کن ہوتی ہے خصوصاً رات کے سناٹے ہیں" اسی طرح جیراردی نرفال اپنی کتاب "سیاحت مشرق" میں لکھتے ہیں۔ "میں نے پہلی مرتبہ موذن کی ایسی پُر تاثیر اور مسحور کن آواز سنی ہے جس نے مجھے ایسا بے خود کر دیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں نے اپنے ترجمان سے دریافت کیا کہ یہ ندا لگانے والا شخص کیا کہتا ہے تو اس نے جواب دیا یہ کہتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں

ہے پھر میں نے ترجمان سے پوچھا اس کے بعد کیا کہتا ہے تو اس نے کہا یہ سونے والوں کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے "اے سونے والو اس خدا پر بھروسہ کرو جو سوتا نہیں ہے"

صوفی منش انشاء پرداز لا فکادیو ہیرن جس نے موذن اول کے نام سے حضرت بلالؓ بن رباح کے بارہ میں ایک مختصر سا کتابچہ تحریر کیا ہے اور جس کا ترجمہ ہم اگلے باب میں پیش کر رہے ہیں، وہ اپنے کتابچہ میں رقمطراز ہیں کہ اس سیاح کا دل جو پہلی مرتبہ شہر کے مشرقی دیواروں کے درمیان اور مسجد کے مینار کے قریب ایک ہلکی سی نیند لیتا ہے اذان کی پُر خشوع و پُر عظمت ہیبت و جلال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو مسلمانوں کو نماز کی دعوت دیتی ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جب یہ سیاح اپنے مطالعہ کی تیاری شروع کرتا ہے تو اس مقدس دعوت یعنی اذان کا ہر بول اس کے قلب میں پیوست ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کی روح میں اترتا چلا جاتا ہے اور اذان کے یہ کلمات موذن کی ترنم ریز آواز کے ساتھ مل کر اس وقت خصوصیت سے عجب سماں پیدا کرتے ہیں جب مصر یا شام میں صبح صادق کی نورانی کرنیں فضا میں چاروں طرف پھیلنا شروع ہو جاتی ہیں مشرق کا یہ سیاح موذن کی اس مسحور کن آواز کو اگلے طلوع فجر سے قبل چار مرتبہ مزید سنتا ہے اس کے کانوں میں یہ آواز دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں بھی آتی ہے اور اس کے بعد وہ اسے سورج غروب ہونے سے قبل بھی سنتا ہے اور مغرب کے وقت بھی یہ سیاح اذان کی یہ آواز سنتا ہے جب کہ پورا مطلع قرمزی اور خالص سونے کے سنہری رنگوں کی طرح جگمگا رہا ہوتا ہے، اور جب یہ روشن اور خوب صورت رنگوں کی دنیا مالٹوں اور زمرد کے رنگوں میں ڈھل جاتی ہے اور پورا ماحول بجلی کے روشن قمقموں سے منور ہونا شروع ہو جاتا ہے اور سب سے آخر میں یہ مشرقی سیاح پھر اذان کے جانفزا کلمات سنتا ہے جو اسرار و رموز میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں اور جب اس کیفیت کے بارہ میں اس کے ترجمان نے اس سے جراروی نرنال کے ریمارکس کے بارہ میں سوال کیا تو سیاح نے جواب دیا بے شک ایسی تشریح اور تفسیر کا جواب نہیں جو ہمیں "اس ذات پر بھروسہ کر جو کبھی نہیں سوتا" کے مختصر جملہ میں عمدہ اور اولیٰ نصیحت کی شکل میں ملتی ہے اور ان آیات مقدس کی طرف ہمارا ذہن لے جاتی ہے جو مشرق کے شہروں میں بعض اہم مقامات اور مقبروں کے پتھروں پر کندہ نظر آتی ہیں ان میں سے ایک آیت **لاتاخذہ سنتہ ولا نوم** بھی ہے جس کا مطلب ہے "نہ خدا کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند" پس اگر ترجمان تاریخ

اسلام سے واقف ہو تو اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ موذن دنیائے اسلام کا وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ ندا نماز کی دعوت دینے اور لوگوں کو خانہ خدا میں بلانے کے لئے لگائی تھی اور یہی وہ عظیم شخصیت تھی جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرض کی بجا آوری کے لئے خصوصی طور پر مقرر کیا تھا۔ اس بزرگ ہستی کا نام بلال بن رباح تھا اور جیسا کہ ترجمان نے اشارہ سے سیاح کو بتایا ہے وہ اسی سرزمین شام میں دمشق کے قریب اپنی آخری آرام گاہ میں محو خواب ہے۔"

ہمیں بلاشبہ اس کا پورا پورا اندازہ ہے کہ ایسے بہت سے سیاح مرد اور عورتوں کے دل و دماغ پر اذان کو بڑا زبردست اثر ہوتا ہے جو جاڑوں کے موسم میں خصوصیت سے ہمارے شہر اسوان میں آتے ہیں یا سوڈان کو آتے جاتے اسوان کے قریب سے گزرتے ہیں یہ سیاح بالعموم اسوان جاتے ہیں تو اذان کی آواز سنتے ہیں اور جب قاہرہ اور اسکندریہ پہنچتے ہیں تو وہاں بھی ان کے کانوں میں اذان کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر اسلامی ملکوں میں ان کو اذان کی آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن جدہ میں ان کے کانوں میں صبح و شام کے وقت اذان کی آوازیں واقعتاً کچھ عجیب ہی سماں پیدا کر دیتی ہیں خصوصاً جمعہ کے ایام میں تو خصوصیت سے یہ کیفیت دوچند ہو جاتی ہے اور یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد کا موذن جو اپنی دلکش اور خوبصورت آواز کے لئے بہت مشہور ہے، دینی حمیت اور فنی کمال یعنی تجوید قرات کا ماہر ہے۔ اس کی اذان سن کر ہم جیسوں کو تو یہ خیال آتا ہے کہ شاید یہ سیاح جو موذن کی آواز کو پوری توجہ سے سنتے ہیں، اس اذان کو ہاتف غیبی کی آواز سمجھ کر پورے دھیان اور توجہ سے سن رہے ہیں یا یوں سمجھئے کہ وہ دور دراز صحرا کو عبور کر کے آنے والے اس پرندہ کا انتظار کر رہے ہیں جو صرف مخصوص وقت میں شاذ و نادر ہی شہر کی طرف پرواز کرتا ہے ان علاقوں میں موذنوں کا ایک طریقہ یہ بھی عرصہ سے چلا آرہا ہے کہ وہ اخیر شب میں سحری کے وقت بڑے بڑے میناروں پر ڈھول اور نقارے بجاتے ہیں اس سے بعض میناروں کے قریب ہوٹلوں کے سیاحوں کو شکایت پیدا ہوئی انہیں حکام سے اس امر کی شکایات کے سلسلہ میں اس لئے اور بھی تردد ہوا کہ وہ اپنی دانست میں اس کو مسلمانوں کا دینی شعائر سمجھتے تھے لیکن جب ان کو بتایا گیا کہ یہ کوئی دینی شعائر نہیں ہے بلکہ شہری لوگ اس کو اپنی عادت اور رسم و رواج کے طور پر کرتے ہیں۔ اس پر سیاحوں کے نمائندوں نے کہا ہمیں

اذان کے متعلق کوئی شکایت نہیں ہے وہ تو ہمارے لئے ایسی ہی خوش کن ہے جیسی مسلمانوں کے لئے البتہ ہمیں ان ڈھول نقاروں سے اضطراب اور بے چینی ہوتی ہے جو ہمارے سروں پر پیٹے جاتے ہیں لیکن اس کو بھی ہم یہ سمجھ کر گوارا و برداشت کر لیتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کا ناقابل تبدیل شعار ہے لیکن ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہر مسلم ملک میں وہاں کے رسم ورواج اور عادات و حالات کے مطابق اس میں تبدیلی لائی جاتی ہے بعض بڑے شہروں میں بڑے ڈھولوں کی بجائے چھوٹے چھوٹے ڈھول دروازوں پر رکھ کر پیٹے جاتے ہیں اور اگر آپ مہربانی کر کے ہمیں اجازت دیں تو ہم شہریوں کو ایسے چھوٹے ڈھول بطور ہدیہ مہیا کر سکتے ہیں بہر حال ہر سائز کے یہ ڈھول اور نقارے ہر موسم میں سیاحوں کی خریداری کے لئے بازار میں فروخت ہوتے ہیں ان سے سوڈان میں دراویش کے عہد میں بڑا کام لیا جاتا رہا ہے مثلاً لشکر کو جمع کرنے غافلوں کو تنبیہ کرنے گانے بجانے یا کسی فیصلہ اور حکم وغیرہ کا اعلان کرنے کے متعدد کام بھی ان کے ذریعہ انجام دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ دراویش کے ملبوسات، اسلحہ، اور ان کی معیشت کے سازوسامان ہمیشہ شہر کے بازاروں میں سیاحوں کی دلچسپ گفتگو کا موضوع ہوتے ہیں۔ حتّٰی کہ یہ سیاح چھوٹے بڑے ڈھول خرید کر خوشی خوشی لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں کیونکہ ان کی تقسیم سے انہیں ایک طرف بڑے ڈھولوں کے شور کے عذاب سے نجات مل گئی اور دوسری طرف ان سے اذان کی مسحور کن آواز میں خلل بھی نہیں پڑتا ہے اور ان کی نیند بھی خراب نہیں ہوتی، ہو سکتا تھا کہ ڈھول کو ابتدائی طور پر مسلمانوں کو نماز کے لئے بلانے کے واسطے اذان کے قائم مقام دے دیا جاتا۔ کیونکہ اذان کے یہ بول جو آج ہم سنتے ہیں مکہ اور مدینہ میں اسلام پھیلنے سے قبل معروف و معلوم نہ تھے۔ پھر اس زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد بھی اتنی کم تھی کہ انہیں آہستہ سے الصلوٰۃ جامعۃ کہہ کر بھی آسانی سے نماز کے لئے جمع کیا جا سکتا تھا لیکن جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کی بجائے کعبۃ اللہ قرار پایا تو مسلمانوں کو نماز کے لئے بلانے کے لئے کوئی ایسا طریقہ سوچنے اور رائج کرنے کی فکر لاحق ہوئی جس کے ذریعہ مدینہ کے قرب وجوار میں بسنے والے تمام مسلمانوں کو مطلع کیا جا سکے اس سلسلہ میں جتنی روایات طبقات ابن سعد میں اور دوسری کتابوں میں مذکور ہیں ان سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ اذان کا طریقہ اختیار کرنے سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منادی الصلوٰۃ جامعۃ کہہ کر لوگوں کو نماز کی اطلاع دیتا تھا اور لوگ جمع ہو جایا

کرتے تھے چنانچہ اس معاملہ میں مذاکرے اور مشورے شروع ہوئے، بعض لوگوں نے بگل بجانے کا مشورہ دیا، بعض نے سنکھ بجانے کا مشورہ دیا، بعض لوگوں نے آگ کا الاؤ روشن کرنے کا طریقہ اپنانے کی رائے دی غرضیکہ کئی باراس موضوع پر گفتگو ہوئی مگر کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر لوگ منتشر ہو گئے، ان مشیروں میں عبداللہ بن زیدؓ الخزرجی بھی شامل تھے ایک روز رات کو جب وہ اپنے اہل خانہ کے پاس آئے اور انہوں نے ان سے کھانا کھانے کو کہا تو انہوں نے نفی میں جواب دیا اور کہا میں دیکھ رہا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک نماز کی بڑی اہمیت ہے یہ کہہ کر وہ سو گئے تو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص سامنے سے گزر رہا ہے اور اس کے شانہ پر دو سبز کپڑے ہیں اور ہاتھ میں ایک سنکھ ہے انہوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اسے بیچنا چاہتے ہو اس نے جواب دیا تم اس کا کیا کرو گے؟ حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے کہا اگر تم اس کو میرے ہاتھ فروخت کر دو تو میں نماز باجماعت کے لئے اس کو بجا کر لوگوں کو جمع کر سکوں گا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتائے دیتا ہوں۔

تم کہو، اللہ اکبر، اشھد ان لا الہ الا اللہ، اشھد ان محمدا رسول اللہ
حی علی الصلوٰۃ، حی الفلاح، اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ۔

اس شخص نے ہو بہو یہ الفاظ ادا کیے وہ مسجد کی چھت پر کھڑا ہوا تھا پھر وہ تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گیا اور پھر کھڑے ہو کر اس نے نماز پڑھی۔ جب عبداللہ بن زیدؓ نیند سے بیدار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا جو کچھ تم کو بتایا گیا ہے وہ تم فلاں کو بتاؤ، اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی حاضر ہوئے اور انہوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسی خواب سے ملتا جلتا اپنا خواب بھی بیان کیا چنانچہ اس دن سے نماز کے لئے مسلمانوں کے بلانے کے لئے اذان دینے کا وہ طریقہ رائج ہوا جو آج تک جاری ہے اس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم "نماز سونے سے بہتر ہے" کا اضافہ کیا جس کی توثیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی البتہ الصلوٰۃ جامعتہ کا فقرہ مسلمانوں کو کسی حادثہ، دعوت یا کسی دیگر معاشرتی اجتماع کے لئے برقرار رکھا گیا۔

مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان اذان کے صیغوں کے بارہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ شیعہ صاحبان حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے ساتھ حی علی خیر العمل کا اضافہ بھی کرتے ہیں اور مالکی حضرات چار تکبیروں کی بجائے دو تکبیریں کہتے ہیں اسی طرح خوش الحانی سے نماز پڑھنے یا ترجیع یعنی شہادتین کو پہلے آہستہ اور پھر بلند آواز سے پڑھنے اور آواز کو حلق میں گھمانے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بشرطیکہ اس سے بعض کلمات کے مخارج اور ادائیگی میں خلل نہ پڑتا ہو۔ البتہ حنبلی حضرات اذان کو بغیر خوش الحانی کے پڑھنے کے قائل ہیں اور اسی طرح احناف بعض ترجیحات میں تصرف کے قائل ہیں۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جیسا اذان کا حق ادا کیا ہے نہ ان سے پہلے کسی نے یہ حق ادا کیا اور نہ ان کے بعد تاریخ اسلام میں کسی نے کماحقہ یہ حق ادا کیا اور یہ بہت بڑا شرف ہے جو حضرت بلالؓ کو ملا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس مقدس مسجد کے پہلے موذن تھے جس کے پہلے امام خود محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم تھے تمام صحابہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کی آواز تمام مسلمانوں کو بڑی محبوب دلکش اور پیاری معلوم ہوتی تھی اور جب ان کی خوبصورت دعوت اذان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرکیف نماز کے ساتھ ملا کر دیکھتے تھے تو اس سے بے حد متاثر ہوتے تھے اور اس سے ان کے دلوں میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آواز کے سحر اور تاثیر میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا لیکن اس کے باوجود فتح مکہ کی خبروں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ کچھ مشرکین حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آواز کو بہت بُرا سمجھتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے تھے اور کہتے تھے کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس غلام کے سوا اور کوئی شخص نہیں ملا جو خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہو کر (نعوذ باللہ) گدھے کی طرح رینگتا ہے، یہ لوگ ویسے بھی کسی شخص کو خانہ کعبہ پر چڑھے ہوئے دیکھ کر بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے جس پر عہد جاہلیت میں کبھی کوئی نہیں چڑھتا تھا چنانچہ جب وہ ایک غلام کو خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہوئے دیکھتے تھے اور ان کی زوردار اذان کی آواز سنتے تھے تو انہیں بڑا خوف اور گھبراہٹ پیدا ہوتی تھی چنانچہ ان میں سے بعض لوگوں نے حارث بن ہشام سے کہا تم دیکھ رہے ہو۔ آج یہ غلام اوپر چڑھا ہوا ہے، انہوں نے حکمت عملی سے اس کو ٹال دیا "ارے بھائی جانے بھی دو اگر خدا اس کو پسند نہیں کرے گا تو وہ اس کو بدل دے گا۔ اسی طرح ایک بار جب حارث بن ہشام ابوسفیان بن

حرب اور عتاب بن اسید خانہ کعبہ کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خانہ کعبہ پر چڑھ کر اذان دینے کا حکم دیا تو عتاب نے کہا ''اللہ اسید کی عزت بڑھائے اور ایسی بات سننے سے اس کو محفوظ رکھے جو اس کو غیظ و غضب میں مبتلا کردے، اس کے بعد حارث بن ہشام نے کہا ''قسم ہے اللہ کی اگر مجھے علم ہو جائے کہ یہ شخص برحق ہے تو میں ضرور اس کی پیروی کروں گا لیکن ابو سفیان نے جو کچھ سنا اس کو بہت برا سمجھا اور جیسا کہ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے وہ کچھ عجب الجھے ہوئے طریقہ پر بولا اور کہنے لگا: ''میں تو کچھ نہیں بولوں گا اگر کچھ بولوں گا تو کنکریاں بھی سب کو اس کی خبر کر دیں گی'' اگر ہم حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے متعلق ان کے سوء ظن کی کوئی بھی تاویل کریں تو بھی اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ وصف تمام مشرکین میں ایسا مشترک تھا کہ ان کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا۔ وہ خانہ کعبہ میں پہلی اذان خواہ فرشتہ کی زبان سے ہی کیوں نہ سنتے ہوں اور پرندوں کی مترنم آواز میں اس کے بول ان کے کانوں میں کیوں نہ پڑتے ہوں، اس سے ان کو کبھی بھی راحت اور خوشی محسوس نہیں ہو سکتی تھی اور یہ آواز بھی ان کو اسی طرح بری لگتی جیسی ان کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی زبان سے بُری معلوم ہوئی اور جس کی وجہ سے انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آواز کو ایک مکروہ جانور کی مکروہ آواز سے تشبیہ دی پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اول تو ایک غلام ہونے کی حیثیت سے بھی مکہ کے سرداروں میں پہلے ہی مطعون تھے، دوسرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی غزوہ میں کوئی مشرک سردار بھی ان کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ اب جب کہ ہم مسلمانوں کے لئے موذن اول کی مسحور کن آواز اور اس کے خوش کن صوتی اثرات نیز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر خیر سے فارغ ہو گئے اور مشرکین کی اس نفرت و کراہت کا ناخوشگوار ذکر بھی ہمیں بادل نخواستہ کرنا پڑا جو ان کو موذن اول حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی سے تھا تو اب صرف ایک امر ایسا باقی رہ جاتا ہے۔ جس پر کم از کم دونوں متفق ہیں اور وہ ان کی بلند و خوب صورت آواز ہے جو فضائے بسیط کو چیرتی ہوئی آسمان کی انتہائی بلندیوں تک پہنچتی تھی اور جس سے مشرکین کے دل پر خواہ کیسی ہی کیفیت گزرتی ہو لیکن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں کے لئے دن میں پانچ مرتبہ اس آواز میں ہاتف غیبی کی صدا اور ایمان و یقین کے روح پرور ترانے سنائی دیتے تھے۔

موذن اول

خلفائے راشدین، عظیم مسلمان رہنماؤں، مفکروں اور صحابہ کرام میں سے جو حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اعلیٰ عہدوں اور ذمہ دار منصبوں پر فائز رہے ان کے بارہ میں تاریخ اسلام کے حوالہ سے جو کتابیں یورپین زبانوں میں شائع ہوئی ہیں ان کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ایسے صحابہ کے متعلق کم ہی کتابیں لکھی گئی ہیں جو نہ کہیں حاکم رہے اور نہ کبھی سیاست میں انہوں نے کوئی قابل ذکر حصہ لیا۔ مثلاً حضرت بلال رضی اللہ عنہ، جن کے بارہ میں بہت کم کتابیں انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں البتہ ان کے متعلق لانکا دیو ہیرن نے ایک مختصر کتابچہ تحریر کیا ہے جو ایک زمانہ میں صحافی کے طور پر امریکہ میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے جزائر غرب الہند میں جو فرانس کے ماتحت تھا کچھ وقت گذارا اور اس کے بعد یہ آنجہانی ادیب مشرقی ملکوں میں بطور سیاح گھومتے پھرتے رہے اور پھر آخر میں جاپان میں مقیم ہو گئے جہاں انہوں نے ایک جاپانی عورت سے شادی کی اور وہیں ۱۹۰۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس دوران میں وہ بلاد عرب میں گھومتے رہے ہوں یا جاپان یا چین میں سیر کرتے رہے ہوں ان میں مشرقی روایات سے دلچسپی اور وہاں کے روحانی اثرات سے کم و بیش اثر قبول کرنے کی علامات پائی گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی سے عربی میں اس فصل کا ترجمہ جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بارہ میں ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس سے اگر ایک طرف ایک مستشرق کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف اس سے انسانی لطف و مروت شعری و ادبی فکاہات نیز ان احساسات و تاثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو اسلامی اذان کے متعلق ہیرن جیسے مفکر اور

ادیب کے ذہن میں پیدا ہو کر ان کے اس کرب و اضطراب کا روحانی علاج کرتے ہیں جس کا مادہ پرست امریکہ اور یورپ کے رہنے والوں کو آج بالعموم سامنا ہے لانکاڈلو ہیرن نے موذن اول کے متعلق جو ایک باب تحریر کیا ہے اس کے دیباچہ کو اس نے اڈون آرنلڈ کے ان اشعار سے مزین کیا ہے جو اس نے خدائے تعالیٰ کی ذات کبریائی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے "اے خداوند قدوس اگر آج زمین پر بسنے والے تیرے تمام زاہدوں و عابدوں کو فنا کا ایک جھونکا دفعتہً صفحہ ہستی سے مٹا دے اور ہر موذن جس کی تکبیر کی بلند آواز سے آسمان کی پر سکون فضا میں غلغلہ پیدا ہو جاتا ہے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے تب بھی یہ دنیا تیرے وجود والا صفات کی آیات و علامات سے خالی نہ رہے گی اور ہاں یہ دنیا اگرچہ اپنی تمام علامات و آیات بینات کے فنا بھی ہو جائے تب بھی تیری عظمت و کبریائی کے چراغ ہمیشہ یوں ہی روشن رہیں گے اس لئے کہ یہ چمکیلا سورج یہ روشن چاند اور جگمگاتے ستارے جو ہر روز شب کی تاریکی میں اجالا کرتے ہوئے واپس آجاتے ہیں ایسے درویش اور زاہد شب زندہ دار ہیں جو تیرے مقدس و پاکیزہ عرش کے گرداگرد گھوم گھوم کر تیرے ذکر کی تسبیح پڑھتے ہیں" اس کے بعد ہیرن نے کہا ہے کہ اس سیاح کا دل جو پہلی مرتبہ شہر کی مشرقی دیواروں کے درمیان اور مسجد کے مینار کے قریب ہلکی سی ایک نیند لیتا ہے اور ان کی اس پُر خشوع اور عظمت بھرے جلال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو مسلمانوں کو نماز کی دعوت دیتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب یہ سیاح اپنے مطالعہ کی تیاری شروع کرتا ہے تو اس مقدس دعوت یعنی اذان کے یہ کلمات موذن کی ترنم خیز آواز کے ساتھ مل کر اس وقت خصوصیت سے عجب سماں پیدا کرتے ہیں جب مصر یا شام کی فضاؤں میں صبح صادق کی نورانی کرنیں فضا میں چاروں طرف پھیلنا شروع ہو جاتی ہیں مشرق کا یہ سیاح موذن کی اس مسحور کن آواز کو اگلے دن طلوع فجر سے قبل چار مرتبہ مزید سنتا ہے اس کے کانوں میں یہ آواز دوپہر کی چلچلاتی دھوپ اور تیز گرمی میں بھی آتی ہے اس کے بعد وہ اذان کی آواز سورج کے غروب ہونے سے قبل بھی سنتا ہے اور مغرب کے وقت جب پورا مطلع قرمزی اور خالص سونے کے سنہرے رنگوں سے جگمگا رہا ہوتا ہے اور یہ روشن اور چمکدار رنگوں کی دنیا ہلکی ہو کر مالٹوں اور زمرد کے رنگوں میں ڈھل جاتی ہے تو پھر اس کے کانوں میں اذان کی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور پھر آخر میں سیاح اس وقت یہ آوازیں سنتا ہے جب بجلی کے قمقموں سے پورا

ماحول منور اور روشن ہو جاتا ہے اور مسجد کے بنفشی گنبد بقعہ نور بن جاتے ہیں اور سب سے آخر میں مشرق کا یہ سیاح ایسے ترنم ریز کلمات سنتا ہے جو اسرار و رموز میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں اور کانوں کو نہایت انوکھے اور عجیب معلوم ہوتے ہیں اور جب اس کیفیت کے بارہ میں اس کے ترجمان نے اس سے پوچھا تو جیسا کہ جرار دی نرنال نے کہا تھا اس نے بھی جواب میں کہا "بے شک ایسی تفسیر و تشریح کا جواب نہیں" یا من..... الخ" یعنی اے شخص اس ذات پر بھروسہ کر جو کبھی نہیں سوتا" اس مختصر سے جملہ میں ہمیں اعلیٰ ہدایت اور عمدہ بصیرت ملتی ہے جو ان مقدس آیات کی طرف ہمارا ذہن لے جاتی ہے جو مشرق کے شہروں میں بعض اہم مقامات اور مقبروں کی لوحوں پر ہمیں کندہ نظر آتی ہیں انہی میں ایک آیت **لاتاخذہ سنتہ ولانوم** ہے جس کا مطلب ہے "نہ خدا کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند" پس اگر ترجمان تاریخ اسلام سے واقف ہو تو اس کو معلوم ہو گا کہ موذن اول دنیائے اسلام کا وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ ندا، نماز کی دعوت دینے اور لوگوں کو خانہ خدا میں بلانے کے لئے لگائی تھی اور یہی وہ عظیم شخصیت تھی جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم فرض کی بجا آوری کے لئے خصوصی طور پر مقرر کیا تھا اس بزرگ ہستی کا نام بلال بن رباح تھا اور جیسا کہ ترجمان نے سیاح کو اشارہ سے بتایا ہے۔ آج اسی سرزمین شام میں دمشق کے قریب اپنی آخری آرام گاہ میں ابدی نیند سو رہا ہے، حضرت بلال رضی اللہ افریقہ کے رہنے والے حبشی النسل سیاہ فام شخص تھے ان کی قوت ایمانی ضرب المثل تھی وہ دین اسلام کو اختیار کرنے اور اس پر پختہ یقین میں مشہور تھے وہ دعوت نبویؐ کے بڑے پرجوش مبلغ تھے ان کی آواز تلحین، و ترجیع اور نغماتی حسن کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ ان کی اذان کے انداز اور آواز کے زیر و بم کو دنیائے اسلام کے موذن چودہ سو سال سے آج تک اپناتے چلے آرہے ہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے قبل اس کے کہ ان کے ذہن میں کسی منارۂ اذان کا خاکہ ابھرے یا ان کی قوم اس لئے نابینا موذنوں کا انتخاب کرے تاکہ وہ مینار کے اوپر سے مدینہ کی نیچی عمارتوں کی چھتوں پر نامحرمانہ نگاہ نہ ڈال سکیں، یوں ہی اذان دینے کو ترجیح دی اور اب تو مسلمانوں کی مسجدوں کے مینار بلندی میں آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں اور اسلامی ممالک میں بے شمار نظر آتے ہیں حتیٰ کہ صحرا کے نخلستان بھی ایسے بلند و بالا اور خوبصورت میناروں سے خالی نہیں ہیں اور کہیں کہیں تو بعض منارۂ اذان پر بڑا سا ہاتھ بھی کچھ اس طرح کا بنا ہوا نظر آتا ہے جس کو دیکھنے سے ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ شاید مینارہ وجد میں جھوم رہا ہے۔ مثلاً اوجلہ کا وہ مینارۂ اذان جس کو فنتور لارگاؤ نے ۱۸۷۷ء میں دیکھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانان عالم خواہ صحرا میں مقبروں پر گنبد بنائیں ان پر پتھروں کی لوحیں نصب کریں یا اس مسجد کے بلند و شاندار مینار تعمیر کریں جو آگرہ میں تاج محل جیسے خوب صورت شاہکار اور حسین مقبرہ کے نزدیک بنی ہوئی ہے، ایک ہی طرح کے وہ بنیادی کلمات سب مقامات میں دہراتے ہیں جو کبھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی زبان سے سنا کرتے تھے موذن کے تقرر وانتخاب کے وقت ان شرائط کا ہمیشہ لحاظ رکھا جاتا ہے جو اذان کی صحیح ادائیگی کے لئے ضروری ہیں مثلاً یہ کہ موذن کے لئے ضروری ہے کہ وہ حافظ قرآن ہو خوش اخلاق و خوش اطوار ہونے کے ساتھ اچھی شہرت بھی رکھتا ہو اور ہر عیب سے پاک ہو اس کی آواز صاف واضح اور بلند ہو اس کا لب ولہجہ فصیح ہو اور وہ الفاظ کے حروف صحیح مخارج سے ادا کرتا ہو۔ لیکن خوبصورت آواز کی جو شرط آغاز اسلام سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے چلی آرہی تھی۔ اب حالات کے لحاظ سے اس میں تھوڑی سی نرمی اختیار کرنا پڑتی ہے فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمتہ نے اپنی مشہور کتاب بستان الورد میں موذنوں اور قاریوں کے انتخاب کے سلسلہ میں اپنے بہت سے ہم عصروں کی نادر آراء حکایات جمع کر دی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک موذن شہر سنجار میں صحیح اور درست اذان دیا کرتا تھا لیکن سننے والوں کے لئے اس کی آواز مکروہ اور سخت ناپسندیدہ تھی لیکن صاحب مسجد ایک ایسا عادل اور انصاف پسند امیر تھا جو کبھی کسی شخص کے ساتھ کوئی برائی نہیں کرتا تھا اسے یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ اس کی طرف سے مسکین موذن کے دل کو ذرا سی بھی کوئی تکلیف پہنچے چنانچہ جب لوگوں نے اس کی کریہہ آواز کی امیر سے شکایت کی تو امیر نے بڑے اچھے اور پیارے انداز سے مخاطب کرتے ہوئے کہا اے میرے آقا آپ سے پہلے اس مسجد میں دو موذن مقرر تھے جن کو پانچ دینار دیے جاتے تھے کیا آپ دس دینار لے کر اذان کی ڈیوٹی ان کے حوالہ کرنے کو تیار ہیں، اس شخص نے امیر کی اس فیاضانہ پیشکش کو بخوشی منظور کر لیا اور شہر چھوڑ کر وہاں سے چلے گئے جہاں تقدیر انہیں لے گئی۔ مگر کچھ ہی دن گزرنے پائے تھے کہ وہ شخص امیر کے پاس واپس آیا اور کہنے لگا اے میرے آقا آپ نے میرے اوپر بڑا ظلم کیا کہ آپ نے دس دینار کا لالچ دے کر مجھ سے یہ مسجد چھڑوالی۔ جن لوگوں کے پاس میں گیا تھا انہوں نے مجھے بیس دینار اس شرط پر

دینے کو کہے ہیں کہ میں ان کے پاس سے چلا جاؤں، یہ سن کر امیر ہنس پڑا اور کہنے لگا وہ تم سے دھوکہ نہیں کر رہے ہیں میرا خیال ہے اگر تم وہاں رہنے پر اصرار کرو تو وہ تمہیں پچاس دینار یا اس سے بھی زیادہ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے مذکورہ بالا کتاب میں اسی قسم کا ایک اور لطیفہ موجود ہے اور اس بات کا یقین اس لئے بھی آتا ہے کہ قرآن پاک کو پڑھنے کا جو معروف روایتی عربی اسلوب ہے وہ تمام دینی و مذہبی تلاوتوں کے معروف اسلوبوں سے نہ صرف بالکل جدا بلکہ ان سب سے اعلیٰ وارفع بھی ہے مذکورہ بالا لطیفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حافظ صاحب قرآن پاک کی آیات تو نہایت عمدہ تجویز و قراءت کے ساتھ پڑھتے تھے مگر ان کی آواز بہت خراب تھی۔ ایک روز ایک دین دار آدمی جب ان کے قریب سے قرآن پاک سنتا ہوا گزرا تو اس نے حافظ صاحب سے دریافت کیا، آپ اس قرآن کے پڑھنے کا کیا معاوضہ لیتے ہو؟ حافظ صاحب نے کہا کچھ بھی نہیں اس پر وہ شخص بولا تو پھر اتنی مشقت کس لئے اٹھاتے ہیں؟ اس نے جواب دیا اللہ کی محبت کے لئے۔ اس پر اس دانا آدمی نے کہا تو بس اللہ کی محبت کی خاطر اب مت پڑھنا، اللہ آپ پر رحم کرے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کا آغاز بحیثیت غلام کے کیا اس لئے کہ وہ حبشی کنیز کے بیٹے تھے وہ اپنے بچپن میں شوخ و شریر بالکل نہ تھے سر ولیم میور نے ان کے بارہ میں لکھا ہے کہ "وہ سیاہ فام شخص تھے ان کے جسم پر کثرت سے بال تھے ان کے خدوخال حبشیوں کے سے تھے وہ دراز اور کشیدہ قامت تھے اور خوش منظر نہ ہونے کے باوجود گٹھے ہوئے جسم کے مضبوط اور توانا شخص تھے مکہ کے غلاموں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا بہت جلد اور گہرا اثر قبول کیا اس لئے کہ یہ غریب لوگ ایسے لوگوں کی غلامی کو ناقابل بیان مظالم برداشت کرنے پڑتے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد عربیؐ کی جس دعوت نے ان لوگوں کو جس آسمانی خدا اور رب کائنات کی طرف راغب و مائل کر دیا تھا اس نے ان کے دلوں کو اس طرح راحت و سکون سے بھر دیا تھا جیسے کسی زخمی انسان کے زخموں پر مرہم کا پھایا رکھ دیا جائے یا کسی کے قلب حزیں کو تسکین و تسلی سے راحت میسر آجائے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ غالباً اپنے ہم قبیلہ اور ہم جنس لوگوں میں سب سے پہلے مسلمان ہوئے تھے۔

اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق کہا تھا کہ حبشہ کے ثمرات میں سے بلال سب سے پہلا ثمر ہیں اور شاید اس چھوٹے سے بچہ نے بچپن ہی میں

اپنی حبشن والدہ سے مسیحی دین کی کچھ ایسی باتیں سیکھ لی تھیں جس کے باعث انہوں نے دین اسلام کی توحیدی تعلیمات کو جلد قبول کر لیا تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان غلاموں اور باندیوں پر مصیبتوں کے پہاڑ اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے ظلم وستم صرف اس لئے توڑے جاتے تھے کہ ان مظلوموں اور بے چاروں کی حمایت کرنے اور انہیں ظلم سے بچانے والا کوئی نہ تھا پورے جزیرۃ العرب میں ایام جاہلیت سے لے کر اب تک یہ دستور چلا آرہا تھا کہ مظلوم کی حمایت اس کے عزیز واقارب اور قبیلہ والے ہی کیا کرتے تھے خواہ اس حمایت ومدافعت میں ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے چنانچہ جو شخص بھی کسی عرب کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بناتا تھا اس کو سب سے پہلے اس کے گھر والوں اور قبیلہ کے لوگوں کے جذبہ انتقام کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور انتقام در انتقام کا یہ سلسلہ بعض اوقات دونوں حریف قبائل میں عرصہ دراز تک چلتا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ اس سخت قبائلی وخاندانی انتقام کے خوف واندیشہ کے باعث دشمنوں کے حملوں سے کافی دنوں محفوظ رہے لیکن ان غریب الدیار اور لاچار وبے کس غلاموں کو ایسی کوئی حمایت کسی طرف سے حاصل نہ تھی۔ اس لئے ظلم کے ہاتھ ان کی طرف آسانی سے بڑھتے تھے اور موت کا سایہ بھی انہی مسکینوں پر ہمیشہ منڈلاتا رہتا تھا۔ عرب کے ریگزاروں میں سخت گرمی کے موسم میں تپتی ہوئی ریت اور چلچلاتی دھوپ میں نہ صرف ان مظلوم غلاموں کو ننگا کر کے لٹا دیا جاتا تھا بلکہ ان کو کئی کئی وقت بھوکا اور پیاسا بھی رکھا جاتا تھا تاکہ ان بے سہارا اور بے کس غلاموں کی ہمت جواب دے جائے اور یہ اسلام سے متعلق اپنے عقیدہ وایمان سے باز آجائیں یہ بدبخت ظالم اسی پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے سامنے ان کے بزرگوں کو گالیاں دیتے تھے اور ان کے محبوب نبیؐ کی شان میں گستاخیاں کرتے تھے اور ان کی زبان سے نبی کریم ﷺ کو برا بھلا کہلوانا چاہتے تھے اور ان مسلمانوں کو چڑانے کے لئے اپنی سچائی کے ثبوت میں لات ومنات اور عزیٰ کی قسمیں بھی کھاتے تھے۔ قرآن پاک نے ذیل کی آیت میں انہی ضعیف ومسکین مسلمانوں کی تسکین وتالیف قلب کے لئے ارشاد کیا ہے انما یفتری الکذب اللذین لا یومنون بایات اللہ واولئک ھم الکاذبون، من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم۔"

"جھوٹ افترا کرنے والے تو بس یہی لوگ تو ہیں جو اللہ کی آیاتوں پر ایمان نہیں لاتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں جو کوئی اللہ سے ایمان لانے کے بعد کفر کرے۔ بجز اس کے کہ اس پر زبردستی کی جائے حالانکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (تو وہ مستثنیٰ ہے) لیکن جس کا سینہ کفر ہی سے کھل جائے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہوگا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

مگر حضرت بلال رضی اللہ عنہ ان تمام ہولناک اذیتوں اور کربناک مظالم کے مقابلہ میں اس طرح ثابت قدم رہے کہ کبھی زبان سے اف تک نہ کی غرضیکہ کوڑوں کی شدید ضربیں پیاس کی شدید اذیتیں چلچلاتی دھوپ اور عرب کے تپتے ہوئے ریگزار پر عریاں سینہ پر رکھے ہوئے گرم پتھر بھی حضرت بلالؓ کے حوصلہ اور استقامت کو شکست نہیں دے سکے، اس کے برعکس وہ ظالموں اور عذاب دینے والوں کا جواب صرف کلمہ احد، احد کی بار بار کی تکرار سے ہمیشہ دیتے تھے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے قبل کی تکالیف کے متعلق فارسی کے مشہور صوفی شاعر خواجہ فریدالدین عطار اپنی کتاب منطق الطیر میں لکھتے ہیں "حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنے کمزور و ناتواں جسم پر لاٹھیوں کی شدید ضربوں کے ساتھ اپنے عریاں جسم پر چمڑے کے اتنے کوڑے بھی کھائے جس سے ان کے جسم پر نہ کھال سلامت رہی تھی اور نہ ہی خون بہنا بند ہوتا تھا لیکن پھر بھی وہ اللہ کے بندے لا الہ الا اللہ کے ذکر و درود سے باز نہیں آتے تھے" چنانچہ ایک روز اتفاقاً جب کہ ان مسکین و مظلوم حبشی غلام کو عذاب الیم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا ایک نحیف الجثہ پستہ قد، شکیل و کشادہ جبیں شخص جو یہ ماجرا دیر سے دیکھ رہا تھا ان کے پاس سے گزرا تو اس نے بھی دوسروں کے علاوہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس دردناک عذاب کو عزم و حوصلہ اور ہمت و استقلال کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ نحیف و نزار شخصیت مکہ کے مشہور تاجر حضرت عبداللہ بن عثمان ابی قحافہ کی تھی جو تاریخ اسلام میں حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حامی و مددگار اور دعوائے نبوت پر اولیں لبیک کہنے والوں میں تھے اور اس غار کے رفیق و صدیق کہلاتے تھے جس کے متعلق روایت ہے کہ اس کے دہانہ پر مکڑی نے جالا تن دیا تھا تاکہ وہؓ اور نبی کریم ﷺ تعاقب کرنے والے جانی دشمنوں کی نظروں سے محفوظ رہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تاریخ اسلام میں رسول اللہ ﷺ کے اولیں صدیق اور انتہائی وفادار اور

مخلص ترین سمجھا جاتا ہے انہی کی بیٹی حضرت عائشہؓ پیغمبر اسلام ﷺ کی رفیق زندگی بنیں اور انہی کے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کے خلیفہ اول مقرر ہوئے اور جو اس وقت تک اپنے مال میں سے تقریباً چالیس ہزار درہم ان غلاموں کی خریداری پر خرچ کر چکے تھے جو مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنے مشرک اور ظالم آقاؤں کے ہاتھوں سخت ترین عذاب بھگت رہے تھے۔ چونکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مظلوم غلاموں اور بے سہارا قیدیوں کی خریداری و رہائی میں اپنا پیسہ بے دریغ خرچ کرتے تھے اس لئے جب ان کے باپ ابو قحافہ ان سے کہتے تھے کہ تم مضبوط و توانا اور طاقتور لوگوں کو آزاد کرانے میں اپنا پیسہ کیوں نہیں خرچ کرتے ہو جو کل کو تمہارے کسی کام بھی آسکیں اور تمہارے قوت بازو بن سکیں تو وہ جواب دیتے تھے۔ میں تو خالصتاً بوجہ اللہ ان کو خرید کر آزاد کر رہا ہوں چنانچہ راویوں کا بیان ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ اور سخاوت و تقویٰ کی بدولت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اتنے فقیر اور تنگدست ہو گئے تھے کہ وہ بھیڑ کی اون کا بنا ہوا نہایت سخت اور کھردرا کپڑا پہنتے تھے اور جب انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو سخت ترین عذاب میں مبتلا دیکھا تو ان سے رہا نہ گیا اور وہ امیہ بن خلف اور اس کے بیٹے کے پاس حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خریدنے کے لئے تشریف لے گئے چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا سودا ایک جبہ اور دس دینار کے عوض طے ہو گیا لیکن کم ہی لوگوں کے دل میں ان پے در پے مصائب کو دیکھ کر یہ خیال گزرا ہوگا کہ کسی دن امیہ بن خلف اور اس کے بیٹے پر ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب یہ دونوں ظالم باپ بیٹے اپنے اس مظلوم غلام سے رحم کی بھیک مانگنے پر مجبور ہوں گے لیکن واقعہ یہ ہے کہ دس سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ دن آگیا اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بدر کے خونین معرکے کے بعد اپنے دونوں سابق آقاؤں پر قابو پانے کا موقع مل گیا انہوں نے ان دونوں باپ بیٹوں کو بدر کے قیدیوں میں دیکھا جس سے ان کے دل کو اس وقت ایک گونہ تسکین ہوئی جب وہ دونوں ان کی نظروں کے سامنے اپنے اعمال کی پاداش کو پہنچ رہے تھے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ وہ پہلے غلام تھے جن کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قیمتاً خرید کر خالصتاً لوجہ اللہ آزاد کیا وہ نہایت تندرست و توانا انسان تھے فارسی قصیدہ میں ان کو

قوت پر قیاس کر کے دیکھی اور پرکھی جاتی ہے۔ چغل خوروں اور جھوٹی باتیں گھڑنے والوں کی زبانیں کبھی خاموش نہیں رہتی ہیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بھی ایسی ہی بے سروپا باتیں بھی بعض لوگوں نے مشہور کر رکھی تھیں ان کا کہنا تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تقویٰ کی نیت سے خرید کر فی سبیل اللہ آزاد نہیں کیا تھا بلکہ اس میں ان کا اپنا ذاتی مفاد پوشیدہ تھا۔

تاہم جن حالات میں یہ نیک بخت اور شعور مند تاجر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ایک عرصہ تک اپنے تجارتی معاملات سے عہدہ برآ ہوتے رہے ان میں اس قسم کی جھوٹی اور غلط افواہیں مشہور ہو جانا کچھ بعید نہیں تھیں مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ان باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے اور ان کو اسی انداز میں **لعنت** ملامت کیا کرتے تھے جس طریقہ و انداز میں قرآن پاک میں ان کو برا بھلا کہا گیا ہے سورۃ والیل میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

والليل اذا يغشى والنهار اذا تجلى وماخلق الذكر والانثى ان سعيكم لشتى فامامن اعطى واتقى وصدق بالحسنى فسنيره لليسرى واما من بخل واستغنى و كذب بالحسنى فسنيره للعسرى وما يغني ماله اذا تردى ان علينا للهدى وان لنا للآخرة ولاولى فانذرتكم نار لايصلاها الا الاشقى الذى كذب و تولى و سيجنبها الاتقى الذى يوتي ماله يتز كى ومالاحد عنده من نعمته تجزى الاابتغاء وجهه ربه الاعلى ولسوف يرضى۔

"قسم ہے رات کی جب وہ ڈھانپ لے اور دن کی جب وہ روشن ہو جائے اور اس کی جس نے نر و مادہ کو پیدا کیا بے شک تمہاری کوششیں مختلف ہیں سو جس نے دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات کو سچا سمجھا سو اس کے لئے راحت کی چیز آسان کر دیں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پروائی برتی اور اچھی بات کو جھٹلایا سو ہم مصیبت کی چیز اس کے لئے آسان کر دیں گے۔ ہے اور بیشک ہمارے قبضہ میں ہے آخرت اور دنیا بھی۔ سو میں تو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈراتا ہوں۔ اس میں وہی بد بخت داخل ہو گا جس نے جھٹلایا اور روگردانی کی اور اس سے پرہیز گار دور ہی رکھا جائے گا جو اپنا مال اس لئے دیتا ہے کہ پاک صاف ہو جائے اور اس کے اوپر کسی کا احسان نہیں کہ وہ اس کا بدلہ اتارے بلکہ وہ اپنے عالی مرتبہ پروردگار کی رضا جوئی کے لئے کرتا ہے اور وہ عنقریب یقیناً خوش ہو جائے گا۔"

اسی لئے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ زندگی بھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے امین خادم بن کر رہے اور اسلام کی نشر و اشاعت میں بھرپور حصہ لیتے رہے اگرچہ بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد واپس مکہ چلے گئے تھے اور قریش کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے جنھوں نے ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں لیکن یہ روایت قطعاً مشکوک اور ناقابل اعتبار ہے اور تاریخی روایت کے علاوہ درایت کے لحاظ سے بھی پایہ اعتبار سے گری ہوئی ہے اس لئے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنی اذان کے بعد سے مسلسل مدینہ ہی میں نظر آتے ہیں جہاں وہ اخیر تک بالاتفاق موذن اول کی حیثیت سے برقرار رہے اذان کا موجودہ طریقہ دعوت اسلامی کے آغاز کے ساتھ شروع نہیں ہوا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ابتدائی دور میں مسلمانوں کی تعداد چونکہ کم تھی اور وہ بالعموم جوار نبیؐ ہی میں رہتے تھے، اس لئے ان کو باجماعت نماز کے لئے الصلوٰۃ جامعتہ کہہ کر بلایا جاتا تھا لیکن جب مدینتہ النبیؐ میں مسجد نبویؐ بن کر تیار ہو گئی اور قبلہ کا رخ بھی مسلمانوں کے لئے بیت القدس سے کعبتہ اللہ کی طرف پھیر دیا گیا تو اذان کا موجودہ معروف طریقہ رائج ہوا، بہرحال خانہ کعبہ کو اگرچہ مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا لیکن قبلہ اول کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے بیت المقدس کی اہمیت کسی طرح بھی کم نہیں ہوئی ہے اس کا احترام اور اس سے تعلق مسلمانوں کو ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ کیا واعظ اور ذاکر علامات قیامت کے سلسلہ میں یہ بیان نہیں کرتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب صبح کی نماز سے قبل بیت المقدس کے قریب نازل ہوں گے۔ تو ان کے نزول سے مسجد منور ہو جائے گی اور اس کے بعد جب محراب امام کی طرف جائیں گے تو وہ سب لوگ جو خود کو ان کا پیروکار کہتے ہیں اس وقت حیران رہ جائیں گے جب وہ علی الاعلان کلمہ شہادت **اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہدان محمدارسول اللہ**۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے سنیں گے۔ اذان کے متعلق ذہنوں میں خیال بھی کچھ عجیب طریقہ پر توفیق الٰہی سے پیدا ہوا، ہوا یوں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبویؐ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اس نو تعمیر وسیع مسجد میں مسلمانوں کو نماز کے لئے بلانے کا وہ طریقہ جو اب تک رائج تھا بدلتے ہوئے حالات میں کچھ زیادہ مناسب اور بہتر نہیں معلوم ہوتا تھا اس لئے کہ **الصلوٰۃ جامعتہ** کے الفاظ سے نہ اسلام کی عظمت و شان کا اظہار ہوتا تھا اور نہ ہی ان سے

اسلامی فرائض اور مسلمانوں کے دینی تقاضے پورے ہوتے تھے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو نماز کے لئے بلانے اور جمع کرنے کے لئے بگل ( ) کا استعمال کیا جائے شروع میں وہ تحویل قبلہ بھی نہیں ( ) چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ذہن میں اذان کے لئے ان آلات کے استعمال کا خیال بھی آیا لیکن اس کے لئے ان کو مدینہ میں ایسا کوئی آدمی نہیں ملا۔ جو ناقوس بنا سکتا۔ اسی زمانہ میں جب کہ صحابہ کرامؓ نماز کے لئے لوگوں کو بلانے اور جمع کرنے کے طریقہ کے بارہ میں غور و فکر اور آپس میں مشورے کر رہے تھے کہ ایک نیک دل اور متقی مسلمان نے خواب میں دیکھا کہ ان کے گھر کے قریب چاندنی رات میں ایک طویل القامت شخص جو سبز کپڑوں میں ملبوس ہے اور ہاتھ میں ناقوس لئے ہوئے سامنے سے گزر رہا ہے یہ مسلمان خود اس شخص کے قریب گئے اور ان سے ناقوس کی خریداری کی بابت دریافت کیا۔ اس پر وہ طویل القامت شخص ہنسا اور کہنے لگا تم یہ ناقوس خرید کر کیا کرو گے اس پر اس نے جواب دیا میں اس کو اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خرید رہا ہوں تاکہ وہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کو نماز کے لئے جمع کر سکیں۔ اس پر وہ طویل القامت شخص جو بات کو مزید طول دینا چاہتا تھا بولا میں تم کو اس سے بھی اچھی چیز بتائے دیتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص مسجد کی چھت پر کھڑے ہو کر اس طرح پکار پکار کر اعلان کرے جیسے میں تمہیں کر کے دکھاتا ہوں اور یہ کہہ کر اس نے ایسے عجیب ترنم آمیز آواز میں اذان کے الفاظ کو پڑھنا شروع کیا جس سے خدائے بزرگ و برتر کی عظمت و جلال کے ترانے کانوں میں گونجنے لگے اذان کے یہی وہ الفاظ ہیں جو آج بھی افریقہ کے ساحل سے لے کر ہندوستان کی سرحدوں تک سنے جاتے ہیں۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اشہدان لاالہ الا اللہ، اشہدان محمدالرسول اللہ،
حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لاالہ الا اللہ۔

اس کے بعد وہ صالح شخص بیدار ہوئے تو ان کے کانوں میں مذکورہ اذان کے نغمہ آگیں الفاظ گونج رہے تھے وہ فوراً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خواب کا سارا ماجرا کہہ سنایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسی طرح غور سے سنا جس طرح رویائے صادقہ کے الفاظ جو من جانب اللہ ہوتے ہیں سنے جاتے ہیں اور انہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اس عجیب و خوب صورت اور دلکش آواز کا خیال آیا جو قدرت نے ان

کے وفادار خادم کو عطا کی تھی چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ان مخصوص کلمات کے ساتھ لوگوں کو نماز کے لئے بلانے کا حکم دیا جو اس مرد صالح نے خواب میں سنے تھے گویہ شب کا آخری حصہ تھا مگر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کلمات جدیدہ کو طلوع فجر سے قبل یاد کر لیا اور ابھی صبح صادق کا نور پھیلنا شروع ہوا تھا کہ اہل مدینہ آواز کا جادو جگانے والے موذن اول بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی مسحور کن آواز سے بیدار ہونا شروع ہو گئے جو مسجد نبویؐ کے اس بلند جھروکہ سے اذان دے رہے تھے جو مستقبل میں اذان کے خوبصورت اور حسین منارہ کی ابتداء اور تمدن و ثقافت اسلامی کی خشت اولیں تھی اور جس نے چودہ سو سال قبل مدینہ کی منور فضاؤں اور روشن ستاروں کے جھرمٹ میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے منارۂ اذان کی پہلی سیڑھی کا کام انجام دیا تھا۔ ان چودہ صدیوں میں اسلامی دنیا میں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا جس میں اذان کی مسحور کن صدا کانوں میں نہ پڑی ہو اذان کے یہ سریلے نغمے ان گنت اسلامی شہروں میں گھڑیوں کا کام بھی دیتے چلے آرہے ہیں۔ اور تاریخی طور پر یہ بات منقول چلی آرہی ہے کہ قیامت کی علامت کے طور پر جب حضرت مہدیؑ نمودار ہوں گے تو ایسی بلند آواز میں اذان دیں گے جو تمام دنیا میں سنی جائے گی۔ اذان کی یہ آوازیں تمام عالم اسلام کے سیاحوں اور اجنبی مسافروں کے لئے اپنے اندر بڑی ندرت اور کشش رکھتی تھیں اور بعض اوقات اس سے ان کو وحشت بھی ہوتی تھی اور خوف بھی پیدا ہو جاتا تھا عالم اسلام میں اذان کی آواز مسلمانوں کے اجتماع اور دعوت کے لئے صلائے عام کی حیثیت رکھتی ہے لیکن بعض اوقات دشمنوں نے مسلمانوں پر حملہ کرنے اور غارت گری کے لئے اذان کو بطور حربہ کے بھی استعمال کیا ہے۔ مشہور صوفی شاعر شیخ فریدالدین عطار کو نیشاپور کا شہر بڑا محبوب تھا ان کا بیان ہے کہ مسلمانان نیشاپور کو ساتویں صدی کے آٹھویں سال اذان کی آڑ میں چنگیز خاں اور اس کی فوجوں نے قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا کیونکہ ان چنگیزی لٹیروں کی عادت ہی تخریب و غارت گری کی تھی یہ لوگ حکومت قائم کرنے اور شہری انتظام بحال کرنے اور سیاسی اقتدار قائم کرنے کے لئے ملک فتح نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا اصل منشاء لوٹ مار اور تباہی و بربادی لانا ہوتا تھا اور اس میں وہ انتہائی سفاکی، بربریت اور ظلم و شقاوت سے کام لیتے تھے وہ شہر پر ایک بار حملہ آور ہو کر اور اس کو تباہ و برباد کر کے تھوڑے سے وقفہ کے بعد دوبارہ جائزہ لینے کے لئے واپس آیا کرتے تھے چنانچہ

ایک مرتبہ جب نیشاپور کو انہوں نے خوب اچھی طرح تاراج کر لیا تو بستی میں دوبارہ داخل ہو کر انہوں نے مسلمانوں کی طرح اذان دینا شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مسلمان پہلے حملہ میں اپنی جانیں بچا کر ادھر ادھر روپوش ہو گئے تھے اور اذان کی آواز سن کر باہر نکل پڑے اور شہر میں داخل ہو گئے اور اس طرح مسلمان ان ظالم چنگیزیوں کے ہاتھوں دوبارہ ان کے مورد عتاب بن کر قتل و غارت گری سے دوچار ہوئے۔ فارس کے اس مشہور شاعر نے تاتاریوں کی وحشی فوج کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح اور حقیقت پر مبنی تھا انہوں نے کہا تھا۔

ان کے حملہ کا مقصد سیادت و سیاست آبادی کاری اور انتظام نہیں تھا بلکہ ان کا اصل مقصد نوع انسانی کی بیخ کنی تھی۔ بہر حال حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی سحر آفریں اذان کی پُر کیف آواز سے لوگوں کو مدتوں مسحور کیے رکھا۔ جس طرح سبز لباس میں ملبوس اس مرد صالح نے خواب سے بیدار ہو کر اذان کے پر کیف و پراسرار نغمے سنا کر لوگوں کو فریفتہ کر دیا تھا۔ سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد اب ہمیں یہ تو مقدرت نہیں ہے کہ ہم اس افریقی موذن کی ذات و صفات کے حقیقی خدوخال آپ کے سامنے من و عن بیان کر سکیں اور ان کی آواز کی نغمگی و موسیقیت اور اس کی خوبیوں پر تفصیل سے روشنی ڈال سکیں لیکن اس طبقہ کی موسیقی کی خصوصیات کچھ ضرور بیان کریں گے جس سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا تعلق تھا اور اسی سے ان کی نغماتی خصوصیات اور آواز پر روشنی پڑتی ہے بظاہر ان کا تعلق باریتونی طبقہ سے تھا جس میں ہمارے نزدیک امتداد اور کثرت و بہتات کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ برخلاف عربی نغمہ کے کہ اس میں مزاج کی تیزی و تندی کیساتھ لغومت و ملائمت کا پہلو بھی ہوتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ عہد جاہلیت میں عربی نغمہ کے فن میں کئی شخصیتیں بہت مشہور گزری ہیں جن کی تعریف فرانسیسی سیاح نے بھی کی ہے ڈاکٹر پیرن نے عرب خواتین کے بارہ میں جو کتاب ۱۸۴۰ء میں لکھ کر الجزائر سے شائع کی اس میں وہ لکھتے ہیں کہ عرب میں خواتین سے فیض اٹھانے والے اکثر غلام ہوتے تھے اور دعوت محمدی کی اشاعت سے قبل یہ تمام گانے والے بالعموم حبشی اور زنجی ہوتے تھے اسی طرح یہ امر بھی بعید نہیں ہے کہ وہ دو مشہور باندیاں بھی جو عاد کی جرادتین کہلاتی تھیں اور اپنے گانوں کے لئے بہت مشہور تھیں، حبشی باندیاں ہی ہوں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ دونوں عبداللہ بن جدعان کی باندیاں

تھیں جو عاد کی نسل سے تھا در اصل عربی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جو عمدہ گانے والوں اچھا شعر کہنے والوں یا ماہر فن آزاد حبشی یا مخلوط النسل کنیزوں سے خالی رہا ہو، ان حبشی النسل سیاہ لوگوں میں ایک شخص وہ بھی گزرا ہے جس نے سبعہ معلقات میں سے ایک معلقہ خود بھی نظم کیا تھا اور اس کے اور بھی متعدد قصیدے، نغمے اور گیت اس سے منسوب ہیں یہ مشہور و معروف شخص عنترہ ابن شداد تھا اور انہی میں فارسی کا شاعر خناف بھی تھا جو خنساء کا چچازاد بھائی تھا اور شنفری بھی ہے جس نے بھی اشعار کا کچھ کم ذخیرہ نہیں چھوڑا اور جس کو اس جنگ کے باعث شہرت حاصل ہوئی جو اس نے اپنے ایک ایسے دوست کا انتقام لینے کی خاطر لڑی تھی جس نے اپنی بیٹی غیر قوم میں بیاہ دی تھی چنانچہ اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ اپنے مقتول دوست کے عوض سو آدمی قتل نہ کرلے گا چین سے نہیں بیٹھے گا غرضیکہ وہ ننانوے آدمی تو قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور آخری آدمی کا سر ان لوگوں نے خود کاٹ کر اس کے پاس پہنچا دیا تھا۔ روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عنترہ کے آنے اور اس سے ملنے کے بہت خواہش مند تھے کیونکہ وہ اسلام کی دعوت اخوت و مساوات سے بے حد متاثر تھا اور عرب کے غلاموں کی نجات خصوصاً اسلامی تعلیمات میں مضمر سمجھتا تھا۔ بہر حال اسلام کی روح آہستہ آہستہ خوب صورت صحرائی قصائد میں بھی سرایت کرتی چلی گئی، جس میں نہ صرف صحرا کے رنگوں کی گرمی بلکہ تپتے ہوئے ریت کی گرمی اور مسموم فضاء کے گرم اثرات بھی ساتھ ساتھ سموتے چلے گئے، یہ حبشی النسل گویے برابر اپنے نغمے الاپتے رہے مگر معلقات نظم کرنے سے گریزاں رہے اور ظہور اسلام کے تین صدی بعد بھی ایسے سیاہ فام حبشیوں اور مخلوط النسل گانے والوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آئی جو اس فن میں کمال اور مہارت تامہ رکھتے تھے۔ چنانچہ خلیفہ عبدالملک نے سعید ابن مذحج کا سارا مال و متاع اس لئے ضبط کرلیا تھا کہ اس کے گانوں اور نغموں کے جادو سے اشراف کی اولاد فتنہ میں مبتلا ہو گئی تھی اور انہوں نے اس کو بے دریغ انعام و اکرام سے نوازنا شروع کر دیا تھا اور اپنی جائداد اس پر لٹانا شروع کر دی تھی جو مکہ کے غلاموں میں سے ایک غلام تھا اسی طرح ابو محجن نصیب بن الزنجی کو بھی امراء اور حکام کی جانب سے عبدالملک کے عہد سے لے کر ہشام کے زمانہ تک بہت کچھ ملتا رہا۔

سنا ہے کہ یزید ثانی نے تو اس کا منہ موتیوں سے بھروا دیا تھا۔ اور ابو عباد معبد نے جو

اپنے زمانہ کے مغنیوں کا سردار تھا تین خلیفاؤں کو بے حد خوش کیا تھا اس نے یزید کو جب وہ اس کا گانا سن رہا تھا طرب وانبساط میں اتنا مست و بے خود بنادیا تھا کہ اس نے ایک ہی دفعہ میں خوش ہو کر اس کو دس ہزار دینار انعام میں دے ڈالے تھے اور ولید ثانی اپنے بھائی کے ساتھ سیاہ ماتمی لباس پہن کر اس کے جنازہ میں شریک ہوا تھا جب کہ اس کی موت بھی اسی کے محل میں واقع ہوئی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سلامتہ الزرقاء جس کے ایک بوسہ کی قیمت چالیس ہزار تک لگ چکی تھی ایک حبشی النسل باندی تھی اسی طرح سلامتہ القس اور حبابہ اس کی دو سہیلیاں مدینہ کی مولدات باندیاں تھی اور سب سے مزے دار عربی کہانیوں میں وہ کہانی ہے جس میں یزید حبابہ کے عشق و محبت میں اس کے مرنے پر اپنی جان تک دے دیتا ہے۔

اور بہت سے قرائن ودلائل سے یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ حبشی کنیزوں کی آوازیں اور ان کے گانوں کے اسالیب وانداز میں مسلمان امراء وحکام کے لئے بڑی کشش وجاذبیت تھی اس کا اندازہ ادبائے عرب واہل فارس کے کلام سے بھی ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ اسماعیل بن جامع نے جو اسلام کے سنہری دور کا سب سے بڑا مغنی کہلاتا تھا ایک حبشی کنیز کو چار درہم صرف اس لئے دیے تھے کہ وہ نادر نغمہ سنا کر نقل کرادے حالانکہ اس وقت یہ کنیز اپنے سر پر مٹی کا گھڑا اٹھائے کہیں جارہی تھی لیکن بعد کو ایک دور ایسا بھی آیا کہ خلیفہ ہارون الرشید نے جب یہ نغمہ سنا تو حیران ہو کر کہنے لگا کہ اس نے آج تک ایسا خوبصورت اور نادر نغمہ نہیں سنا تھا اور خوش ہو کر مغنی کو اس نے چار ہزار دینار بطور انعام دیے اور اس کے ساتھ نہایت عمدہ سازو سامان سے آراستہ ایک مکان بھی اس کو رہنے کے لئے دیا اس موقع پر فارسی کے مشہور شاعر شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی منجملہ دوسری باتوں کے یہ بھی بتاتے ہیں کہ مسلمان امراء وسلاطین کے دربار میں ان حبشی گویوں اور موسیقاروں کی موسیقی کے فن میں آغاز اسلام کے بعد تک بڑی قدردانی تھی منجملہ دیگر روایات کے انہوں نے نہ صرف ایک روایت دراویش کے حالات کے متعلق بھی اپنی کتاب بستان الورد میں نقل کی ہے بلکہ اس کے عینی شاہد بھی بیان کیے ہیں۔ شیخ سعدیؒ کا بیان ہے کہ "میں ایک مرتبہ چند ایسے نوجوانوں کے ہمراہ جہاز کی طرف روانہ ہوا جو راستہ بھر وقفہ وقفہ سے صوفیائے کرام کے اشعار ترنم سے گاتے چلے جارہے تھے ہمارے ساتھیوں میں ایک متقی شخص بھی تھے جو [illegible] کے سلوک اور احوال کے منکر تھے کیونکہ وہ ان کی کیفیات واسرار سے قطعاً ناواقف تھے [illegible] جب ہم لوگ

بنی ہلال کے نخلستان میں پہنچے تو ہمیں بعض عربوں کے خیمے نظر آئے جہاں سے ایک حبشی نوجوان ایسی دلکش آواز میں گاتا ہوا نمودار ہوا۔ جس کی آواز سن کر چرند پرند بھی درختوں سے نیچے اترنے لگتے تھے اور جب میں نے اپنے ساتھی کے اونٹ پر نظر ڈالی تو اس پر بھی اس کے مسحور کن گانے کا ایسا اثر دیکھا کہ اس نے اپنے سوار کو نیچے گرادیا اور جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا یہ ماجرا دیکھ کر میں نے اس آدمی کو پکار کر کہا ارے بھائی اس جانور کی آواز نے تمہارے جانور میں تو یہ اثر دکھادیا مگر تم پر تو اس کا مطلق اثر نہیں معلوم ہوتا'' دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم عربوں کے عادات واطوار میں یہ بات داخل تھی کہ وہ اپنے اونٹوں کو کسی دور دراز مسافت پر لے جانے اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرانے کے لئے حدی خوانوں کی آواز پر بہت کچھ انحصار کرتے تھے۔ چنانچہ جنٹیوس نے اس واقعہ کے ذیل میں بستان الورد کے ترجمہ میں ایک دوسرا واقعہ مذکورہ واقعہ سے بھی عجیب تر بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک معتبر مؤلف صحرا میں ایک ایسے شخص کے یہاں مہمان ہوا جس کے تمام اونٹ مر گئے تھے کچھ دیر کے بعد اس مہمان کے پاس ایک حبشی غلام دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ وہ اس کے آقا سے اس کی سفارش کر کے اس کا قصور معاف کرادیں۔ چنانچہ جب دستر خوان پر کھانا لگ گیا تو اس مؤلف مہمان نے کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور میزبان سے کہنے لگا کہ وہ اپنے غلام کا قصور معاف کردے، میزبان نے کہا کہ اس کا غلام بڑا ہی خبیث ہے اگرچہ اس نے اس غلام پر اپنا مال ومتاع لٹادیا ہے مگر اس نے اس کو تباہ کردیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو بڑی خوبصورت اور نہایت اچھی آواز دی ہے اس لئے میں نے اس کو اونٹوں کا حدی خوان بنادیا تھا اس نے اپنی آواز کے جادو سے اونٹوں کو چلا چلا کر ہلاک کردیا ہے کہ اس نے تین دن کی مسافت ایک دن میں طے کرائی جس سے ان کے پیٹ کے بچے تک ضائع ہو گئے اب چونکہ تمہاری مہمانی کا مجھ پر حق ہے اس لئے اس کے بارہ میں اب میں تمہاری سفارش قبول کرتے ہوئے اس کو معاف کرتا ہوں۔''

لطائف وظرائف کے اس سلسلہ میں جو مشرق کے حدی خوانوں کے بارہ میں بیان کیے گئے ہیں ایک اور لطیفہ وہ ہے جو جلال الدین نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے ان کا بیان ہے کہ منصور نے سالم حدی خواں کو **نصف** درہم اس لئے دیا تھا کہ اس نے اپنی حدی خوانی سے اس کو اتنا خوش کردیا تھا کہ وہ اپنے اونٹ پر سے گرنے لگا تھا اس پر سالم نے کہا میں نے جب

ہشام کے لئے حدی خوانی سے اس کو اتنا خوش کر دیا تھا کہ وہ اپنے اونٹ پر سے گرنے لگا تھا اس پر سالم نے کہا میں نے جب ہشام کے لئے حدی خوانی کا فریضہ انجام دیا تھا تو اس نے خوش ہو کر مجھے دس ہزار درہم عطا کیے تھے اس میں شک نہیں کہ ایام جاہلیت نیز اسلام کے ابتدائی عہد میں یہ گانے والے اور حدی خواں بالعموم غلاموں اور حدی خوانوں میں سے ہوا کرتے تھے اور یہ حبشی غلام نہایت خوبصورت اور عجیب و دلکش آواز کے مالک بھی ہوتے تھے اور اس فن میں اپنی مہارت و ملکہ کے باعث بلند ترین مرتبوں پر فائز ہو جاتے تھے۔ اس لئے اس امر میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں بھی یہ ملکہ درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا ان کی آواز کی حسن و خوبی کے متعلق جو کچھ منقول ہے وہ غلط نہیں ہے بلکہ حرف بحرف صحیح اور سچ ہے اور یہ دوسری بات ہے کہ آیا وہ اس ملکہ اور عمدہ آواز و ترنم کے خود ہی موجد تھے جو ان سے دوسرے موذنوں کو پہنچا ہے یا وہ اس انداز و طریقہ پر اذان دیتے تھے جیسی ان کو ہدایت و تلقین کی جاتی تھی۔ بہر حال اب ہمارا فرض ہے کہ ہم سب سے پہلے یہ بیان کریں کہ قدیم ترین عربوں میں موسیقی کے ساتھ شغف کے شدید احساس کے باوجود ان میں موسیقی سے وہ شدید لگاؤ پیدا نہیں ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ وہ ایک کلمہ کو بار بار دہراتے تھے تجوید و تحوید اور مد و قصر سے بھی کام لیتے تھے حتیٰ کہ جدید عربوں میں بھی غنا و سرود کے متعلق کم و بیش یہی رویہ بر قرار رہا حتیٰ کہ پیرن کو کہنا پڑا کہ مصر میں ایسا کون سا سیاح ہے جس نے کلمہ یا لیل کو گھنٹہ بھر یا اس سے زیادہ دیر تک دہرانے اور اس کی تکرار کرتے نہیں سنا اور اغلب یہ ہے کہ عربی راگ یا نغموں میں عہد نبویؐ میں بھی تین قسم کے نغموں سے زیادہ اضافہ نہیں ہوا ان میں سے ایک وہ ہیں جو بسیط نغمے کہلاتے ہیں اور یہ سنجیدگی و وقار بہادری یا نرمی کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں دوسرے وہ جنگی نغمے اور اونٹوں کو ہنکانے والے نغمے ہیں جو مرکب نغمے کہلاتے ہیں اور یہ متعدد حرکات اور صوتی ترجیحات سے ترکیب پاتے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو خفیف نغمے کہلاتے ہیں یہ وہ ہیں جو سننے والے کو ہلکی پھلکی تفریح اور خوشی مہیا کرتے ہیں یا سنجیدگی و متانت سے نکال کر ہزل و ظرافت کی طرف راغب کر کے غم و اندوزہ سے نجات دلاتے ہیں چونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ غلام تھے وہ بلا شبہ فرصت کے اوقات میں اونٹوں کو ہنکا کر لے جاتے ہوں گے اس لئے فطری طور پر اونٹوں کو ہنکانے اور لے جانے والے نغمے ہی گاتے بھی ہوں گے اور اس طرح بسیط نغموں سے کام لیتے ہوں گے

لیکن اپنے ابنائے جنس افریقیوں کی طرح اکثر وبیشتر وقت نکال کر مرکب نغمے بھی ضرور گاتے ہوں گے اور شاید اسی لئے وہ اذان بھی اپنے موثر طریقہ اور معروف انداز میں پڑھتے ہوں گے اور یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ جو نغمے وغیرہ خواب میں سنے جاتے ہیں وہ یادداشت میں کم ہی محفوظ رہتے ہیں چنانچہ وہ نغمہ یا بول صالح اور متقی مسلمان نے سبز لباس میں ملبوس ایک شخص سے خواب میں سنے تھے ان کا پوری طرح ذہن میں محفوظ رہنا اور پھر بیدار ہونے پر ان کا زبان سے اس وقت ادا ہونے لگنا جب کہ وہ اس خواب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کر رہے تھے ایک مشکل امر ہے اس(۱) لئے یہ امر کچھ بعید نہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے خود یہ اذان سنی ہو اور اسے سن کر اس آواز و لحن میں ڈھال لیا ہو جس کی صلاحیت ان میں افریقی سلیقہ و شعور کے باعث پہلے ہی موجود تھی۔ اور اس صورت حال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کو علیٰ حالہ بر قرار رکھنے کی اجازت دے دی ہو، جس طرح صبح کی اذان میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو الصلوٰۃ خیر من النوم کے اضافہ کی اجازت مرحمت فرمادی تھی۔

اور یہ بات اس لئے بھی قریب الفہم ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ہمیشہ ان کی ترتیل و لہجہ کے اسلوب پر بر قرار رکھا اور ان کو ہمیشہ اپنا مقرب اور معتمد بنائے رکھا وہ ان سے مہمات امور میں مشورہ بھی طلب فرماتے تھے اور ان کو دوسرے موذنوں پر خصوصی ترجیح بھی حاصل تھی چنانچہ ان کی موجودگی میں اذان دینے کی اجازت اس دوسرے شخص کو بھی نہیں تھی جو اذان کے لئے مقرر تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ومعیت میں زندگی بھر رہے وہ آپؐ کو اذان دینے کے بعد قرآن پاک کی کوئی آیت تلاوت کر کے جگادیتے تھے اور کبھی حکمت و تقوے پر کوئی جامع کلمہ کہہ کر آپؐ کو بیدار کرتے تھے اور جب نماز کے لئے مسجد میں تمام نمازی جمع ہو جاتے تھے تو لوگوں کی نظریں اس افریقی موذن کی طرف اٹھی رہتی تھیں جو پہلی صف میں کھڑے ہوتے تھے تاکہ نماز میں ان کی حرکات وسکنات کی تقلید کر سکیں کیونکہ موذن پر اذان کے علاوہ امام کے ساتھ تکبیر کہنے اور دعا پڑھنے کی ذمہ داری بھی اسی طرح عائد ہوتی ہے جس طرح کی ذمہ داری ایک (۱) پادری کی ہوتی ہے جو بشپ کو مدد دے کر مسیحی نمازوں میں اپنی ذمہ داری پوری کرتا ہے جیسے جیسے اسلام کی قوت و شوکت میں اضافہ ہوتا گیا

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور اذان کے بھی علاوہ اہم امور ان کے سپرد کیے جانے لگے چنانچہ وہ بیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خزانچی بنا دیے گئے اور اس مال و متاع کے امین قرار دیے گئے جو ان ہاتھوں میں پہنچتا تھا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو فتح مکہ کے دن خانہ کعبہ کی کنجیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اس وقت دی تھیں جب آپ فاتحانہ طور پر اپنی سواری پر مکہ میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی تھے جنہوں نے اس عظیم الشان عمارت کی سب سے بلند جگہ پر چڑھ کر پہلی اذان دی تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی اس دن نماز کے لئے اذان دے رہے تھے جب حضر موت کے سلاطین اسلام لانے کے لئے مدینۃ النبیؐ میں حاضر ہو گئے تھے اور یہ ہی وہ شخص تھے جو داعی نماز کی حیثیت سے اس وقت بھی لوگوں کو بلا رہے تھے جب اسلام کا لشکر جرار بت پرست مشرکوں سے جنگ کرنے کے لئے صحرا عرب پر چڑھائی کر رہا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائین میں سے تھے چنانچہ جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجتہ الوداع کے لئے روانہ ہوئے تو وہ حضور اکرمؐ کی راحت و آلام کے لئے حتی المقدور راستہ بھر کوشاں رہے وہ رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں چل رہے تھے اور ان کے سر پر دوپہر کی سخت گرمی میں اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے کپڑے سے سایہ کرتے چل رہے تھے اور غالباً اس سفر میں وہ وادی کے ان مقامات سے بھی گزرے جہاں سادات قریش موذن رسولؐ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو سورج کی تپش میں سخت ایذائیں دیا کرتے اور دردناک عذاب میں مبتلا رکھتے تھے پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو یہ عجیب و غریب خوب صورت اور پراسرار آواز دفعتاً ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی چنانچہ نماز کے لئے لوگوں کو بلانے اور جمع کرنے کے لئے دوسرے موذن کا بندوبست کیا گیا اس لئے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عہد کر لیا تھا کہ نبیؐ کے بعد اب وہ کسی دوسرے امام کے لئے اذان نہیں دیں گے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ انہوں نے کتنا وقت خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رفاقت و معیت میں گزارا لیکن اسی کے ساتھ سب کو اس کا اعتراف ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تمام مسلمانوں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ایک مرتبہ انہوں نے جب اپنے

ایک حبشی نژاد بھائی کے لئے ایک آزاد عرب خاتون کا رشتہ مانگا تو قبول کر لیا گیا اتنی بڑی یہ رعایت و منزلت ان کو ایک ایسی قوم کی جانب سے مل رہی تھی جس کو اپنی نسبی شرافت اور غیر مخلوط نسلی عظمت پر بڑا فخر و غرور تھا۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خلیفہ اول کے بعد بعض مہم پر حاکم و سردار بنا کر بھی بھیجا گیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے خلیفہ عادل نے جب حضرت خالدؓ بن ولید جیسے جانباز اور اسلام کے مخلص و وفادار اور کمانڈر کا محاسبہ کرنا چاہا تو اس اہم کام کے لئے بھی ان کی نظر حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر ہی پڑی جنھوں نے مسلمانوں کی بھری محفل میں بڑی بے باکی سے **جھپٹ** کر حضرت خالد بن ولید جیسے اسلام کے مایہ ناز سپوت اور سر فروش سپہ سالار کے سر سے عمامہ اتار لیا اور اسی عمامہ سے ان کے ہاتھ باندھ دیے اور بار بار یہ اعلان بھی کرتے جاتے تھے کہ یہ سب کچھ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر کیا جارہا ہے مگر اس واقعہ کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بارہ میں کچھ سننے میں نہیں آیا لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام پہنچے تو اس وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بارہ میں صرف اس قدر معلوم ہوا کہ وہ بھی شام آچکے ہیں اور متعدد بار اسلامی لشکر کے ساتھ جہاد میں شرکت کر چکے ہیں اس کے بعد حکومت کی طرف سے ان کو شام کے مضافات میں تھوڑی سی زرعی اراضی بھی دے دی گئی جس پر وہ کھیتی باڑی کر کے گزر بسر کرنے لگے البتہ اس عرصے میں وہ معاشرتی زندگی سے بالکل کنارہ کش رہے یہ وہ وقت تھا جب اکثر صحابہ کرامؓ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اسی طرح بعض دیگر صحابہ بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک جہاد رہے تھے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے تھے غرضیکہ یہ وہ وقت تھا جب پرانی نسل کی جگہ نئی نسل لے رہی تھی، مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی حالات اور زندگی کی اقدار کافی بدل چکی تھیں، سادہ بدری زندگی کی جگہ تعیش و کامرانی، غربت و تنگدستی کی جگہ خوشحالی و فارغ البالی لے رہی تھی جس کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ اسلامی فتوحات کا غیر متناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا روم و ایران اور دوسرے مفتوحہ ممالک سے خزانوں کے لدے ہوئے اونٹ دارالحکومت میں چلے آرہے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو ان کی آنکھوں میں اس اندیشہ سے آنسو آگئے کہ مسلمان اس چمک دمک

کی زندگی میں پڑ کر آخرت کو فراموش کر دیں گے اور رشک و حسد کا شکار ہو کر فتنہ و فساد میں مبتلا ہو جائیں گے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے مرفعہ الحالی و خوشحالی کے اس منظر کے ساتھ یہ بھی دیکھا کہ جس دین و ایمان کی خاطر انہوں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے عذاب اور دکھ اٹھائے تھے اور مصیبتیں جھیلی تھیں اب وہ ابو طالب کے کنبہ سے باہر نکل کر اور صحرائے عرب کو عبور کر کے صرف شام و عراق، مصر و فلسطین تک پہنچ چکا تھا اور براعظم افریقہ تک بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے اور آخر میں تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی نسل ہی کے ایک شخص نے اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھا کہ اسلام کا سورج مشرق و مغرب میں ایک طرف اسپین، اٹلی اور فرانس کے افق پر نمودار ہو رہا ہے اور دوسری طرف صحرائے عرب کے گھوڑ سوار ایران کو فتح کرنے کے بعد کابل و قندھار کے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں۔ بہر حال حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کی آواز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پہلے جانشین خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد ایسی خاموش ہوئی کہ پھر کبھی یہ صدائے دلنواز و شیریں سننے میں نہیں آئی۔ ان کے ذہن میں شاید یہ خیال سما گیا تھا کہ جو آواز اللہ کے آخری نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سنی اور اپنے ساتھ دوسرے مسلمانوں کو سنوائی اب ان کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد اور کسی کو کیا سنانی ہے؟ بہر حال ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ جب حضرت بلالؓ مدینہ سے شام چلے گئے تو وہاں پہنچ کر انہوں نے وہ اذان دینا از خود بند کر دی جو کبھی ستاروں کے جھرمٹ اور مدینہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی روشنی میں مدینۃ النبیؐ کی معطر فضاؤں میں دیا کرتے تھے لیکن آج وہ شام کے ان مکینوں کے اصرار پیہم کے باوجود بھی اذان دینے کو تیار نہ تھے جو ان کی بے حد قدر و منزلت کرتے تھے اور ایک بار پھر ان سے اذان سننے کے لئے بے تاب تھے البتہ ان کی یہ خاموشی صرف اس وقت ٹوٹی جب خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے شام کا دورہ کیا اور رؤسا شام اور عوام نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اذان سنوانے کا پر زور مطالبہ کیا اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا "اے میرے سردار و آقا! آج میری اور میرے ساتھ مسلمانان شام کی آپ سے اذان دینے کی یہ آخری درخواست ہے امید ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر حضرت بلالؓ کو مجال انکار نہ تھی

اور وہ اذان دینے پر آمادہ ہو گئے جو ان کی زندگی کی آخری اذان تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دین جدید کے متوالے نوجوانوں میں جو دینی شغف، حمیت و غیرت ملی پائی جاتی تھی اس میں حضرت بلالؓ کے دینی جذبہ اور کوششوں کو بڑا دخل تھا ان کی روح پرور اذان کے نغموں کے بول اہل مدینہ کے قلب و روح میں جو آتش شوق بھڑکائے رکھتے تھے اس کی مثال کم از کم ہمیں دین مسیح کے کسی درویش و عالم اور دین موسوی کے کسی راہب کے یہاں نہیں ملتی ہے۔

چنانچہ جب شہر کے لوگوں نے یہ خوشخبری سنی کہ وہ موذن نبوی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اذان کے پر کیف و مسحور کن نغمے دمشق کی فضاؤں میں ایک بار پھر سنیں گے تو ان کی خوشی و مسرت کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔ انہوں نے اس کو اس لئے بے حد مغتنم سمجھا کہ اس اذان کی آواز میں ان کو اپنے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس و متبرک پیغام و آواز کا پرتو محسوس ہوتا تھا۔ کاش حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ اذان و آواز کسی صورت سے محفوظ ہو سکتی تو لوگ موذن اول کی روح پرور اذان سے آج بھی اسی طرح محظوظ ہوتے جس طرح قرن اول میں مدینہ کے خوش نصیب مسلمان اس سے محظوظ ہوتے تھے۔



عُلُومُ العَرَبِيَّة

اللغة ۔ النحو ۔ النقد

جناب پروفیسر سیّد محمّد کبیر احمد مظہرؔ

شعبۂ عربی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں تقریباً ۲۵ برس سے پڑھا رہے ہیں۔ انھوں نے اب تک ۲۰ کتب تحریر کی ہیں اور ان کے تحقیقی مقالات کی تعداد ۷۰ سے زائد ہے۔ ان کی زیرِ نگرانی ایم اے عربی کے تقریباً ۳۰ تحقیقی مقالات THESIS لکھے جا چکے ہیں۔ عربی زبان و ادبیات کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی تصوّف میں بھی خصوصی تعارف رکھتے ہیں۔

"عُلُوم العربیہ" جناب مصنف کی نئی تصنیف ہے اور ان کے لیکچرز کا پہلا مجموعہ ہے۔

قیمت ۱۵۰٫۰۰ روپے

ادبستان ۔ ۸ بینک اسکوئر دی مال ۔ لاہور
فون: ۷۳۵۳۰۶۶ ۔ ۷۳۲۱۶۶۶